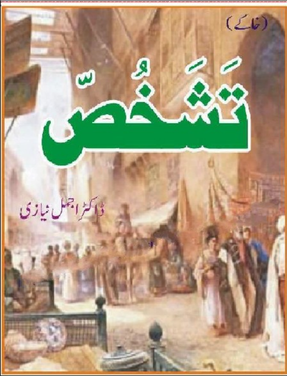

(خاکے)
تَشَخُصّ
ڈاکٹر اجمل نیازی

تشخص

(خاکے)

ڈاکٹر اجمل نیازی

آپ بیتی کا جہان دیگر

کچھ لوگ پراسرار ہوتے ہیں کچھ لوگ پراسرار لگتے ہیں۔ شہاب صاحب میں یہ دونوں اوصاف تھے اتنا بڑا افسر اور اتنا بڑا آدمی۔ اتنا سادہ آدمی اور اتنا گہرا آدمی جاننے والا آدمی تھا۔ لگتا ماننے والا تھا۔ افسر شاہی میں فقیرانہ مزاجی اختیار کی۔ فقیر میں امیری کا ہنر ظاہر نہ ہونے دیا۔ اہل دل میں سے تھا۔ اہل خبر میں سے بھی ہوگا۔ بال آخر بے خبری کی محویت کو نعمت سمجھا۔ یہ انداز اپنایا کہ کوئی آسانی سے پہچان نہ سکے۔ ممتاز مفتی کے پرخلوص واویلے کے باوجود لوگوں نے روایتی طور پر اسے تسلیم نہ کیا۔ وہ اپنے آپ کو منوانے آیا بھی نہ تھا۔ صرف اس لیے آیا تھا کہ یوں بھی جیا جا سکتا ہے لوگ سوچتے ہی رہے کہ یہ کیا افسر تھا۔ اس کام میں لوگ حیران ہوئے۔ پریشان بھی ہوئے کہ اس کے بعد کوئی ایسا افسر نہ ہوا میرے لیے یہ ایک غمزدہ نشاط کا لمحہ ہے کہ میں یہ باتیں اس لمحے کے دل میں بیٹھ کر لکھ رہا ہوں۔ جب شہاب صاحب نہیں ہیں۔ شاید یہ بھی کوئی ایسی اوپری بات نہیں کہ اپنی موت اور خود نوشت کی اشاعت سے پہلے 3 جنوری 1984ء کو روزنامہ جنگ پنڈی کے ادبی ایڈیشن میں شہاب صاحب نے ایک انٹرویو میں کہا ''شہاب نامہ'' میری آخری کتاب ہے۔ شہاب کو یہ بات نجانے کس نے بتائی تھی کہ اور کیا اس سچ کو ثابت کر دکھانے کے لیے انتقال کرنا اتنا ہی ضروری تھا۔ ممتاز مفتی نے ان کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے غلط ہے کہ یہ ان کی زندگی میں لکھا گیا ہے ممتاز مفتی اب جو کچھ ان کے بارے میں لکھیں گے وہی ہو مگر صحیح ہوگا۔ یہ بجھارت نہیں۔ قصہ یہ ہے کہ ایسے لوگوں کے لیے جو کچھ لکھا جاتا ہے صحیح یا غلط نہیں ہوتا۔ اصل بات تو ان دونوں کے درمیان کہیں ہے۔ میں جو کچھ لکھ رہا ہوں پتہ نہیں کس کے لیے لکھ رہا ہوں۔ شہاب صاحب ان لوگوں میں سے تھے جنہوں نے کئی زندگیاں گزاریں۔ کیا خبر اب بھی کہیں وہ اپنی کوئی زندگی بسر کر رہے ہوں۔ اور ہمیں تو یہ بھی خبر نہیں کہ ہم جو زندگی گزار رہے ہیں۔ کس کی زندگی ہے کہنے والے کہیں گے کہ شہاب صاحب نے بڑی بھرپور زندگی بسر کی۔ مگر انہوں نے اپنے کاسہ حیات کو عمر بھر خالی رکھا اور یہی ان کا کمال تھا وہ کئی بازاروں سے گزرے مگر خریدار نہ بنے اور اپنے دامن اور اپنے باطن کو ایک بے نیازی سے بھر لیا۔ وہ بہر حال کچھ اور آدمی تھے۔ ''شہاب'' نامہ میں بھی اصل بات باتوں میں چھپا دی گئی ہے۔ کون ڈھونڈے گا وہ بات ہر انسان ایک مختلف اکائی ہے مگر جانتا نہیں کوئی جان لیتا ہے تو ہمارے دانشوروں کو مروڑ اٹھنے لگتے ہیں وہ سب کو ایک ہی ڈربے میں بند دیکھنا چاہتے ہیں۔ شہاب نے کب کہا میں کوئی خاص مخلوق ہوں۔ مگر کیا وہ واقعی عام سے آدمی تھے اور کیا انہیں غیر معمولی کہنا کوئی

خلاف معمول حرکت ہے۔ ہماری افسر شاہی کی تاریخ میں کتنے اور شہاب ہیں۔اس آسمان پر دوست ستارے اتنے کم ہیں کہ انہیں گنتے ہوئے شرم آتی ہے۔ جو دو چار ہوتے ہیں ان کی روشنی زمین پر آنے ہی نہیں دی جاتی اونچی آواز میں صرف یہ کہا جاتا ہے کہ بہت بڑا بیوروکریٹ تھا جی یہ شہاب صاحب۔

صدر ایوب جیسے مطلق العنان کو اپنے شیشے میں اتار لیا۔کوئی پوچھے کہ یہ شیشہ اسے مل کیسے گیا تھا۔پھر شہاب صاحب نے یہ شیشہ توڑ کیوں دیا۔اور اس کی کرچیاں اتنی تعداد میں کیسے بکھر گئیں کہ اب تک بکھر رہی ہیں اور اس کی کیا وجہ ہے کہ اتنا بڑا شیشہ ٹوٹا اور کسی نے اس کی آواز نہ سنی۔اب یہ آواز گونج رہی ہیں جب شیشہ کسی کے ہاتھ میں نہیں ہے۔

آخر عمر شہاب صاحب پر ایک چپ سی طاری رہی یا وہ چپ پر طاری رہے چپ چاپ لوگ اپنے آپ میں کب ہوتے ہیں جتنے غیر غیر لگتے ہیں اتنے ہی اپنے اپنے ہوتے ہیں شہاب صاحب مجالس میں تو اپنی خموشی میں پناہ گزین رہتے تھے۔ایسا اور میں نے فیض صاحب کی محفل میں دیکھا وہاں خموشی کا راج ہوتا تھا جیسے ہر چہرے پر ”بولنا منع ہے“ کا بورڈ لگا ہوا ہو۔بہر حال طبیعتوں میں یہ وصف یونہی نہیں پیدا ہو جاتا ہے۔اس لحاظ سے فیض صاحب بھی فیض یافتہ آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ایک دفعہ شہاب صاحب سہیل عمر کے ہاں مہمان تھے۔ وہاں واصف صاحب' اشفاق احمد' سراج منیر' جاوید احمد الغامدی اور اکرام چغتائی بھی تھے بہت بھری بھری محفل رہی۔دو گھنٹے سے زیادہ کی بیٹھک میں دو شخص دو کلمات بمشکل ہی کہہ سکے۔”السلام علیکم وعلیکم السلام“ یہ تھے شہاب صاحب اور جاوید احمد الغامدی۔اگرچہ ان دونوں حجرات کے علم وفضل میں (اپنے اپنے منفرد میدان کے حوالے سے) کوئی کلام نہیں یہ وصف کسی کے صاحب کمال ہونے کے لیے بڑا ضروری ہے۔ جو لوگ اچھے سامع ہوتے ہیں جب بولتے ہیں تو ان کی آواز کسی نہ کسی راز کی بازگشت ہوتی ہے۔یہ ضروری نہیں کہ وہ خود بھی اس راز سے واقف ہوں۔

اپنے آخری دنوں میں شہاب صاحب سے میری کچھ لمبی نشستیں رہیں۔دو ایک ایسی موجودگیوں میں شیما مجید بھی موجود تھیں۔کچھ دور اشفاق احمد بھی تھے۔ایک دفعہ دیر تک میرے ساتھ جو باتیں کرتے رہے۔ایسے جیسے کسی اور کو کچھ کہہ رہے ہوں۔ایک خاص لمحے میں آدمی جس سے بات کرتا ہے تو اس کا مکاطب کوئی اور بھی ہوتا ہے۔جب اس طرح مکالمے کا فن آ جائے تو پھر مراقبے کا ذوق بھی پیدا ہوتا ہے۔اس دن انہوں نے مجھے وہ واقعہ خود سنایا تھا جب انہوں نے سلطان باہو کے مزار کے سائے تلے ایک مسجد میں رسول اکرم کی خدمت میں حضرت فاطمہ کی وساطت سے یہ درخواست گزاری تھی کہ انہیں تصوف کے سلسلہ اویسیہ کے ذریعے حق اور حقیقتوں تک رسائی کی توفیق دے شہاب صاحب کو یقین تھا کہ حضور کبھی فاطمہ کی بات نہ ٹالتے تھے۔سلسلہ اویسیہ کی خواہش ہے اس

لیے کہ اس سلسلے میں براہ راست روح محمد سے فیض ملتا ہے۔شہاب صاحب کی اس استدعا کی قبولیت کی نوید ان کی اپنی نومسلم جرمن نژاد بھابھی کے ذریعے ملی۔اسے اس بات کا علم نہ تھا۔یہ بات حضرت فاطمہ نے خواب میں اسے بتائی تھی۔شہاب صاحب نے یہ واقعہ سنا کر مجھ سے پوچھا کیا میں یہ واقعی شہاب نامہ میں شامل کر لوں۔تو میں نے ان سے کہا تھا کہ اگر آپ یہ واقع نہ لکھیں گے تو میں آپ کے والے سے لکھ دوں گا۔اب انہوں نے یہ واقعہ لکھ دیا ہے تو میں سوچ رہا ہوں کہ میں کیا لکھوں۔اور میری یہ بات کون مانے گا کہ میرا تعلق بھی سلسلہ اویسہ سے ہے۔میرے پیرو مرشد حضرت اللہ یار خان مرحوم نے سلسلہ اویسہ کے ذریعے فیض پا کر اپنے دوستوں تک پہنچایا۔وہ بہت مختلف رتبے کے صوفی تھے تب شہاب صاحب کے پاس بیٹھے ہوئے اشفاق صاحب نے مذاقاً کہا تھا کہ آپ ہم سے اس طرح سے راز و نیاز کی باتیں کرتے۔اس نجوان سے کیا خاص بات ہو رہی ہے تو شہاب صاحب کے ہونٹوں اور آنکھوں میں الگ الگ مسکراہٹ چمک اٹھی تھی۔میں ان سے نہ پوچھ سکا کہ ان مسکراہٹوں کے کیا معنی ہیں اور ان میں جو فرق ہے اس کا کیا مطلب ہے ظاہر ہے یہ بات اشفاق صاحب سے بھی نہیں پوچھ سکتا۔انہیں معلوم ہے تو بھی نہیں بتائیں گے مجھے لگتا ہے کہ اس واردات میں میرے لیے کوئی خبر کوئی سندیسہ ہے کیا اس کے لیے میں بھی بارگاہ نبوی سے جواب کا منتظر ہوں۔مگر کیا میں وہاں سے کسی جواب کا مستحق بھی ہوں۔اگرچہ اپنے حضرت کے مطابق میں بارگاہ بنوی میں حاضر کی سعادت حاصل کر چکا ہوں مجھے ان کی بات کا یقین ہے مگر اس احساس کے ساتھ ہی میرے اندر ایک کہرام بپا ہو جاتا ہے۔

ایک بات اور مجھے محسوس ہوئی کہ شہاب صاحب کی شخصیت میں اسرار تو بے شمار ہیں انوار کم ہیں۔ایک شفاف اندھیرا سا دکھائی پڑتا ہے۔ایسے اندھیرے میں دکھائی بھی دیتا ہے میرے خیال میں روشنی میں کچھ نہیں۔کچھ ہے تو سب کو نظر آتا ہے سب کچھ اندھیرے میں ہے۔حقیقت میں وہی کچھ ہے جو نظر نہیں آتا۔جو اسے دیکھ لے بس وہی دیکھنے والا ہے۔جس چیز کے ارد گرد بہت روشنی ہوتی ہے۔اس کے اندر بہت اندھیرا ہوتا ہے۔اندھیروں میں دیکھنے والے دل کے اندھے نہیں ہوتے۔میں جو باتیں کر رہا ہوں شہاب صاحب اس طرح باتیں نہیں کرتے تھے۔ان کی باتوں میں بظاہر نہ فلسفہ ہوتا تھا نہ فراست ممتاز مفتی نے بڑی کوشش کی کہ انہیں کوئی بالا بالا چیز ثابت کر دیا جائے۔شاید میں بھی یہی کر رہا ہوں۔اگرچہ میں قطعاً ایسا ارادہ نہیں رکھتا۔یہ چیزیں کوئی ثابت تو نہیں کی جاتیں ایسی باتیں لوگ مان لیتے ہیں۔بغیر دلیل کے بغیر بیان کے بیان کرنے سے ان باتوں کا جمال گم ہو جاتا ہے اور دلیل دینے سے جلال ضائع ہو جاتا ہے کچھ لوگ کہیں گے شہاب صاحب میں جلال کہاں تھا۔میں کہتا ہوں کہ یوں تو جمال بھی انمیں ایسا کب تھا۔جلال و جمال چھو کر دیکھنے والے چیز بھی ہے مگر یہ تو ایک کیفیت ہے جو کسی کے لیے عام کر دی جاتی ہے اور عوام محسوس کرنے

لگتے ہیں۔''

شہاب صاحب کو جلال کے لیے کسی اہتمام کی ضرورت نہ تھی۔ ان جیسے افسران فرعوان کی نسل کے بچھڑے ہوئے بلکہ بگڑے ہوئے بندے بلکہ بچے لگتے ہیں۔ ایسا آدمی جب درد سے آشنا ہی ہوتا ہے تو محبوب یعنی صاحب جمال بن جاتا ہے۔ حاکم صرف اپنائیت کے ذریعے ہی ہردلعزیز بنتا ہے۔ حکم اور عدل ایک ذات میں یکجا ہوجائیں تو زمانہ بدل جاتا ہے کچھ کچھ سنور بھی جاتا ہے۔ مگر ہمارے ہاں ایسا کم ہوا بلکہ نہ ہونے سے بھی کم ہوا۔ اس لیے اکادکا مثال بھی مشعل کی طرح نظر آتی ہے۔ ہمارے افسروں کو اکیڈمی میں صرف اعتدال کی ہی تربیت نہیں دی جاتی۔ پھر وہ کون تھا جس نے شہاب صاحب کی زندگی میں شرافت اور شائستگی کی شان پیدا کی۔ انہوں نے اپنے اختیار کو اعتبار میں بدل دیا۔ اور اقتدار میں اعتدال کی تاثیر گھول دی۔ میں نے جھنگ کے ایک بوڑھے شخص سے شہاب صاحب کا ذکر کیا تو وہ میرے پاس کھڑا روتا رہا۔ بوڑھی آنکھوں سے آنسو دیر تک نہیں بہہ سکتے۔ میں نے دیکھا کہ آنسوؤں کے بغیر رونا بھی ممکن ہے میں نے سوچا کہ شہاب صاحب نے اپنی خودنوشت میں بہت ''جھوٹ'' بولے ہیں جن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہ جھنگ میں ڈپٹی کمشنر تھے۔

غالباً صاحب پہلے سول افسر بیوروکریٹ تھے جو اردو کے ادیب ہوئے ان کے بعد یہ سلسلہ چل نکلا۔ شیخ منظور الٰہی' مختار مسعود' منیر احمد شیخ' مسعود مفتی' ڈاکٹر صفدر محمود' طارق محمود اور شہزاد قیصر یہ نام اس وقت ذہن میں آئے ہیں۔ منظور الٰہی بھی فقیر منش افسر ہوئے۔ انہوں نے ''درِدلکشا'' لکھی دروازہ کھول کر بند کر دیا اور خود باہر نکل آئے۔ اب دروازہ خود کھلے گا۔ دیکھیں وہ کیا کرتے ہیں۔ مختار مسعود نے آواز دوست تحرکی۔ کیا مختار صاحب کو معلوم ہے کہ ان کے دل میں کون تھا جو ان کا دوست ہوا۔

غالب ندیم دوست سے آتی ہے بوئے دوست

اب وہ شخص ان کا دوست کیوں نہیں رہا۔ تخلیقی نثر میں مختار دوسرے نمبر پر ہیں۔ مگر ان کا شہاب صاحب سے موازنہ کرنا مقصود نہیں۔ افسری منظور الٰہی کے اندر چھپی پھری۔ مختار مسعود افسری میں چھپے پھرتے ہیں۔ کہانی کار منیر احمد شیخ جب بھارت میں پریس کونسلر تھا تو سفارت خانہ پاکستان پورا پاکستان بنا ہوا تھا۔ وہاں کے لوگ کہتے تھے کہ ایسے لوگ سفارت کار ہونے چاہیں اور وہ ادیب ہوں تو اور بھی اچھا ہے۔ مسعود مفتی کو میں جانتا نہیں۔ صفدر محمود مجھے بھول گئے ہیں۔ طارق محمود کو میں نے یاد کر لیا ہے۔ ان تینوں میں ایک قدر مشترک ہے کہ انہوں نے مشرقی پاکستان کے حوالے سے کتابیں لکھی ہیں ''چہرے'' پڑھتے ہوئے ہیں دیر تک کانپتا رہا۔ ''پاکستان کیوں ٹوٹا'' پڑھ کر بے طرح سوچتا رہا۔ ''اللہ میگھ دے'' پڑھتے ہوئے کئی راتیں جاگتا رہا۔ گہری فطرت والا طارق محمود کچھ

کچھ شہاب صاحب جیسا ہے۔ جب شہاب نوجوان افسر تھے۔ طارق سے مل کر شہاب یاد آتے ہیں۔ شہزاد قیصر کو انشائیہ نگار مشہور کیا جا رہا ہے حالانکہ ان کی کتاب ''کلیرنس سیل'' میں کچھ اچھے مزاحیہ مضامین بھی ہیں۔ وہ شاعر بھی ہیں اور میں یہاں افسر شاعروں کی بات نہیں کرنا چاہتا۔

''ماں جی'' ''یا خدا'' اور بالخصوص ''شہاب نامہ'' کا اسلوب کسی بھی مروجہ نثر سے مختلف ہے۔ اس کو خوبی یہ ہے کہ اگر یہ ایسا مختلف نہیں بھی تو لگتا ہے مجھے تو لگتا یہ بھی گلتا ہے جیسے زندگی ایک کہانی ہے کہانی ہی تو ہے شہاب صاحب کہانی کہنا چاہتے تھے۔ کہانی بنانا بھی جانتے تھے۔ بہت لوگ زندگی کو ایک چھوٹی سی کہانی بھی نہ بنا سکے اور وہ بھی ہیں جو چھوٹی سی کہانی میں پوری زندگی کھینچ لاتے ہیں۔ شہاب صاحب کے پاس بڑی کہانیاں تھیں۔ سچی کہانیاں کوئی کہانی جھوٹی نہیں ہوتی۔ جو کہانی بیان ہو گئی۔ وہ کہیں نہ کہیں ہوئی بھی ہو گی یہ بھی سوچا کسی نے کہ لوگ کہانیاں کیوں مزے سے پڑھتے ہیں۔ یہی بات سب باتوں کا جواب ہے اور اسی لیے ''شہاب نامہ'' ایک دوست کتاب بن گئی ہے۔

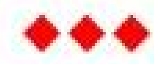
کئی مائیں شہاب صاحب کی ''ماں جی'' جیسی ہوں گی مگر بالکل تو نہیں پھر ان کا خدا بھی کچھ اور ہو گا اور وہ خود بھی۔ کوئی آدمی خود سے پوری طرح واقف نہیں ہو سکتا یہ خودنوشت اس بات کی گواہی ہے کہ یہ فن اپنی شخصیت میں ان امکانات کے کھوج لگانے کا کام ہے۔ جو زندگی کی ویرانیوں اور وسعتوں ناکامیوں اور شادکامیوں تنہائیوں اور گہرائیوں' مشہوریوں اور مجبوریوں کے درمیان بکھرے ہوئے چھپے پڑے ہیں ''شہاب نامہ'' ان لمحات کا عکس ہے جب آدمی کی ذات اور زمانہ کہیں اور یکجان ہوتے ہیں۔ میرے خیال میں ہر آدمی کو اپنی خودنوشت بیان کرنی چاہیے۔ ہر آدمی کی زندگی میں کچھ نہ کچھ ایسا ہوتا ہے جو کسی دوسرے کو پیش نہیں آتا۔ اس کے پاس ہوتا ہے جو کسی اور کو معلوم نہیں ہوتا۔ یہ ایک بات ہے کہ اس بے چارے کو خود بھی معلوم نہ ہو سکے کہ اس کے پاس کیا تھا۔ شاید آپ بیتی کہتے ہوئے اسے یاد آ جائے۔ کسی تخلیقی لمحے کی آغوش میں اس رپ وہ بیت جائے جو تاریخی اور تہذیبی طور پر اس کا واقعہ نہ بن سکا ہو۔ اردو کے ادیبوں میں جوش دانش اور انتظار وغیرہ نے آپ بیتیاں لکھی ہیں۔ کنور مہندر سنگھ بیدی کی خودنوشت بھی ایک افسر کی رام کہانی ہے مگر اسلوب اور واقعے کے اعتبار سے یہ کسی عام علاقے کی بات ہے۔ ڈاکٹر معین اور زہرا معین نے رشید احمد صدیقی اور آل احمد سرور کی مختلف تحریروں سے ریزہ ریزہ چن کر آپ بیتیاں لکھی ہیں۔ یعنی کسی کی آپ بیتی کوئی اور بھی لکھ سکتا ہے گویا بظاہر غیر متعلق تحریر میں بھی آپ بیتی بن سکتی ہیں۔ ہمارے کئی شاعروں اور صوفیوں کی تخلیقات ان کی آپ بیتی ہیں۔ کئی مقامات پر آپ بیتی اور جگ بیتی ایک ہو جاتی ہے جو پورے عہد میں گزرتا ہے۔ وہ ایک آدمی کے دل میں بھی اتر سکتا ہے یوں بھی ہوتا ہے کبھی کہ ایک فقرے

میں مکمل آپ بیتی ہو جاتی ہے بعض اوقات کسی کی آپ بیتی ایک فقرے میں بیان کی جاسکتی ہے۔ان دونوں بیانات میں بڑا فرق ہے۔امرتا پریتم نے اپنی خودنوشت کا نام رسیدی ٹکٹ رکھا ہے۔اور رسیدی ٹکٹ چیک پر لگایا جاتا ہے۔امرتا اور کئی دوسروں نے اس طرح اپنے اپنے چیک وصول کر لیے ہیں۔

شہاب نامہ ایسی آپ بیتی ہے جس میں کئی آپ بیتیاں سمائی ہوئی ہیں۔اس میں جن جن عورتوں مردوں کا ذکر ہے جیسے انہوں نے خود اپنا تذکرہ شہاب صاحب کو لکھوایا ہے۔قوموں کا عروج زوال شہاب صاحب کے سامنے تھا وہ ایک اونچے دائرے میں تھے۔ ان دائروں کو وہ غبارے بنا کر اڑاتے رہے اور زندگی ان کے لیے بازیچہ اطفال بن گئی۔وہ اس میدان سے گزر کر ایک اور میدان میں چلے گئے۔وہ خود ایک میدان تھے میدانوں میں دیوار و در نہیں ہوتے مگر ان میں داخل ہونے کے لیے بڑا دل گردہ چاہیے ہیں میں بھی کوئی حکمت ہوگی کہ "شہاب نامہ" کی اشاعت سے پہلے ہی شہاب صاحب چلے گئے اپنی آپ بیتی لکھنے کے بعد کچھ دیر زندہ رہتے ہیں۔وہ خود بھی اپنی آپ بیتیں تو انہیں کسی اور کی آپ بیتی لگے۔"شہاب نامہ میں سے کچھ ابواب مختلف رسالوں میں شائع ہوئے تھے۔مگر مکمل خودنوشت کا رنگ اور ہوتا ہے۔بالعموم یہ بات بڑی خصوصیت کی حامل سمجھی جاتی ہے کہ فلاں شخص کی زندگی کھلی کتاب کی طرح ہے۔شہاب صاحب کتاب تھے کھلی کتاب نہ تھے۔اس کتاب کے کچھ صفحات تو خود شہاب صاحب نے بھی نہ پڑھے ہوں گے۔البتہ شہاب صاحب کو پڑھتے ہوئے پڑھنے والے کے اندر کئی کتابیں کھل جاتی ہیں ہم بالکل اسی طرح زندگی گزار لیں جس طرح شہاب صاحب نے گزاری پھر اپنی آپ بیتی لکھیں تو وہ اور ہی کتاب ہوگی۔"شہاب نامہ بھی کچھ اور ہی کتاب ہے۔یہ کتاب پڑھ کر شہاب صاحب کے لیے کیسے بڑے بڑے خیال آتے ہیں۔مگر وہ جگہ جگہ اپنے لیے تقریباً طنزیہ انداز اختیار کرتے ہیں۔جیسے کوئی مجرم رنگے ہاتھوں پکڑا گیا ہو۔خود احتسابی کا یہ مسلسل قرینہ ہمارے دل میں ان کے لیے ایک انجانی محبت پیدا کرتا چلا جاتا ہے۔ابتدائیہ اور اختتامیہ کے علاوہ کہیں بھی کتاب میں کوئی شعوری کوشش محسوس نہیں ہوتی۔شہاب صاحب کی زندگی بھی تو کسی فطری رہبری کے حوالے سے ہوتی رہی۔لوگ الزام کا انتظار کرنے سے کبھی باز نہیں آئے اور شہاب صاحب نے یہ کتاب صرف الزام کے محاذ پر بیٹھے ہوؤں کے لیے نہیں لکھی۔آخر میں جو انہوں نے دھیمے سروں میں کچھ دعوے کیے ہیں وہ تو غیر محسوس انداز میں پوری کتاب میں کہیں کہیں موجود ہیں اور دل پہ اثر کرتے ہیں پہلا اور آخری باب ان کے لیے ہیں جنہیں یقین ہی نہیں آتا۔میں بھی کئی دفعہ حیران ہوا کہ یہ کیا آدمی ہے یہ آدمی ہے یا حیرت ایمان کی دہلیز ہے جن لوگوں نے "شہاب نامہ" میں "چندراوتی" پڑھا ہے نجانے انہوں نے کیا پڑھا ہے۔کوئی بھی آج کا وارث اس داستان کو منظور کر کے لوک داستان بنا سکتا ہے

شہاب صاحب نے اس اکیلی رات کا قصہ ہی پورے کا پورا بیان کیا ہوتا تو یہ بھی ایک کتا بہوتی۔ رات جو انہوں نے مسجد اقصیٰ میں گزاری۔ ایک زندگی پہ بھاری ہوسکتی ہے لیلۃ القدر بھی ایک رات کا نام ہے اور یہ رمضان کے علاوہ بھی کسی مہینے میں ہوسکتی ہے۔ شہاب صاحب بھیس بدل کر اسرائیل گئے۔ پتہ چلا تا تھا کہ وہاں فلسطینی طالم علموں کے لیے کھولے گئے سکولوں کا حلیہ کس طرح چپکے چپکے بگاڑا جا رہا ہے اس طوفانی اور روحانی مہم کے دوران قدمقدم پر جانے جانے کا خطرہ تھا۔ جگراتوں کا ہجوم شہاب صاحب کی آنکھوں میں اڈا پڑتا ہے۔ کئی لوگوں کی آنکھوں میں دیکھ کر شک پڑتا ہے کہ واقعی رات سونے کے لیے بنائی گئی ہے۔ حضرت شہاب صاحب پوری زندگی ہی بھیس بدل کر گزار گئے۔ اور جگراتے ان کے ہمسفر تھے۔ مگر وہ تہجارات جب ان کا نوجوان ہمراز نہیں بظاہر نیند کی حویلی میں بند کر کے چلا گیا اور عشا کے بعد قبلہ اول کو تالے لگ گئے۔ اندر تہذیب اور تقدیس کے مہیب سناتے نے شہاب صاحب کو سر سے پاؤں تک غڑاپ سے نگل گیا نسل انسانی کی ہزاروں سال کی خوابیدہ تاریخ ایک ہی انگڑائی لے کر جاگ اٹھی اور کہکشاں کی طرح جگمگ کرتی ہوئی شاہراہوں پر بڑے بڑے ذی شان پیغمبروں کے قدموں کی خاک سے نور کے چشمے پھوٹنے لگے کتنے لوگ جانتے ہیں کہ نینداور بیداری کسی مقام پر ایک عمل بنتے ہیں۔ شاید اسی کو مراقبہ کہتے ہیں مراقبہ یا مکاشفہ اصل میں کیفیت ہے۔ عمل جب کیفیت بن جائے تو جسم اور روح کی دوئی ختم ہوجاتی ہے۔ جو کچھ اس رات میں شہاب صاحب نے محسوس کیا تھا بیان کر دیتے تو ان پر اور فتوے لگ جاتے ان کا اور مذاق اڑتا۔ مگر وہ اس پر قدر کب تھے کہ سب کچھ بیان کر دیتے۔ میں ایسے لوگوں کو جانتا ہوں جو مراقبے میں واقعہ معراج کا مشاہدہ کر لیتے ہیں اس رستے میں پہلا پڑاؤ مسجد اقصیٰ ہے۔ جہا تما انبیاء نے رسول اکرم کی اقتدار میں نماز ادا کی تھی۔ یہ نماز اب تک ادا ہو رہی ہے۔ ہم بڑی آسانی سے اپنی ان باتوں کا انکار کر دیتے ہیں کہ اقرار کرنا بڑا مشکل ہے۔ مشکل ہے تو ایک رتبے کی بات بھی ہے ہم سے تو یہ بھی نہیں ہوتا کہ اپنے محلے کی مسجد میں ایک رات ہی اس طرح گزار لیں کہ اور کوئی نہ ہو۔ اندھیرا ہوئے بے داغ اور اندیشہ ہو بے دار شہاب صاحب کی یہ تحریر ایسے ہی کسی لمحے کے دل میں بیٹھ کر پڑھنے والی چیز ہے۔ اس تحریر اس تحریر میں ایک تحریک ہے جو اسے عظیم ادب پارہ بناتی ہے۔ اس سارے تذکرے میں شہاب صاحب کا انکسار اور افتخار ہم رتبہ دکھائی دیتے ہیں۔ اس معرکے میں فلسطینی نوجوانوں کی دلیرانہ رفاقت پہ بھی رشک آتا ہے کروڑ پتی باپ کے صوم صلوٰۃ کے پابند اکلوتے مجاہد بیٹے نے اسرائیل میں دس روز تک گھریلو ملازم کی طرح شہاب صاحب کی خدمت کی اور انعام کے طور پر دیئے گئے آٹھ پونڈ اپنی آنکھوں سے لگا لیے۔ وہ کچھ دنوں کے بعد بلڈ کینسر کے ہاتھوں موت کی وسعتوں میں کھو گیا۔ وہ یقیناً فلسطینی مسلمانوں کے لیے کسی مشن پر ہی اگلے جہان گیا ہوگیا۔ ہو نوجوان شہاب صاحب سے کم مرتبے کا آدمی نہ تھا۔ شہاب صاحب کہتے ہیں کہ اس کی

جدائی کا احساس میرے دل و دماغ کی ظلمت پر چند لمحوں کے لیے ایک نا قابل بیان غمگینی اور رنگینی کی پھواری برساجا تا ہے۔ ارض فلسطین پر بھی لہو کی پھوار اور اشکوں کی پھوار مل کر برسے جارہی ہے یہ کون سی جدائی کا نتیجہ ہے۔ سوالوں کی پھوار موسلا دھار بارش میں بدلتی ہے اور مجھے کہیں پناہ نہیں دکھائی دے رہی۔ عجیب مایوسی ہے جو مجھے فکر مند نہیں ہونے دیتی۔ میں ایک بار پھر ''شہاب'' نامہ پڑھنے لگتا ہوں۔''



خطہ تدریس کی سلطنت

میں جب گورنمنٹ کالج میں پڑھتا تھا تو وہاں ڈاکٹر محمد اجمل ڈاکٹر سلطان احمد پروفیسر خواجہ محمد سعید پروفیسر مرزا محمد منورؔ پروفیسر چوہدری محمد نواز اور پروفیسر جیلانی کامران تھے اس پہلی صف کے آگے ڈاکٹر نذیر تھے۔ یہ سات لوگ تھے۔ مجھے لگتا ہے کے ہر دور میں ایسے سات آدمی ہوتے ہیں۔ مرتبے کا فرق بہر حال ہوتا ہے۔ کسی نہ کسی حد تک اس انداز کے لوگ اب بھی ہوں گے تلاش شرط ہے۔ پروفیسر نواز تو ہیں۔ ڈاکٹر عبدالمجید اعوان کا معاملہ یہ ہے کہ وہ ڈائریکٹر نذیر سے محبت رکھتے ہیں۔ اور محبت سے بڑی نسبت کیا ہے۔ نسبت آدمی کی شخصیت میں ہمرنگی کھولتی رہتی ہے یہ میں اپنی لگن میں بات کر رہا ہوں ہر آدمی کو حق ہے کہ اپنے سات آدمی تلاش کرے تو اس کا مطلب ہے کہ ہر شخص کے اپنے سات آدمی ہوتے ہیں جو اس کے ساتھ ہوتے ہیں۔ گورنمنٹ کالج میں تو پھر کئی سات ہوں گے۔ مگر کوئی تو ہوتے ہیں جو سب کے ہوتے ہیں۔ جس طرح لاہور لاہور ہے گورنمنٹ کالج گورنمت کالج ہے تو ڈاکٹر نذیر ڈاکٹر نذیر ہے۔

کسی کے جیسا ہونا بھی ایک رتبے کی بات ہے اور یہ کریڈٹ بھی اس شخص کو جاتا ہے جو کسی کے شیوہ و شخصیت کی مشابہتیں اور مطابقتیں پیدا کرنے کی خواہش اور کوشش میں مگن ہے۔

ڈاکٹر نذیر کا کمال یہ تھا کہ انہوں نے گورنمت کالج کے مغربی وتہذیب وتعلیم کی رنگ آرائیوں میں مشرقی انداز و اطوار کی سادگیوں کی خوشبو شامل کر دی۔ اس طرح ایک مربوط اور مضبوط تخلیقی علمی ماحول وجود میں آ گیا۔ فضاؤں کو بیورو کریٹک رجحان کی بجائے ڈیمو کریٹک مزاج نصیب ہوا۔ اور جمہوری رنگ میں عوامی امنگ کھلتی چلی گئی گورنمنٹ کالج کے انگریز یا انگریز نما پرنسپلوں کے برعکس ڈاکٹر نذیر شلوار قمیض میں ملبوس پاؤں میں دیسی جوتی لمبے بکھرے ہوئے بال چہرے پر جنگلی معصومیت۔ لگتا کہ کوئی ہپی پرنسپل کے دفتر پر قابض ہو گیا ہے۔ اس مہذب اور معزز ہستی نے کالج کو ایک نے موسم سے آشنا کیا یہ نہیں کہ ان دنوں ڈسپلن نہیں تھا۔ مگر کہیں بھی تخلیقی سرگرمی رنگ نہیں پکڑتی جب تک ڈسپلن کچھ ڈھیلا نہ کیا جائے۔ بس یہ کہ طلبہ اپنے طور پر نظم و نسق کی پابندی کریں۔ اس وقت ہر شخص یہ سمجھتا تھا کہ میری بھی کچھ ذمہ داری ہے اور ذمہ داری کے کئی رنگ ہیں۔ بے رنگ صرف سازش اور منافقت ہوتی ہے۔ اب ہمارے تعلیمی اداروں میں انہی دو کارستانیوں کا زور ہے۔ اپنی کم علمی اور کم مائیگی چھپانے کے لیے ہر طرف دھول اور

دھواں پھیلانے کی کوشش کی جارہی ہے وہ ایک سرشار زمانہ تھا جب ڈاکٹر نذیر گورنمنٹ کالج کے سربراہ تھے۔ پرنسپل کے عہدے کو سربراہ کا نام ڈاکٹر نذیر کی دلاویز اور زندہ جاوید شخصیت کا تحفہ سمجھنا چاہیے۔ اس وقت کی کیا بات تھی جدھر نظر اٹھتی ایک سے ایک آدمی لگ مرتبے کا آدمی نظر آتا۔ گہری دانشوری کے انوکھے مقام پر فائز ڈاکٹر اجمل ایک مخلص ماہر تعلیم چٹان کی طرح مضبوط ذہین اور بادلوں جیسے گدازوں والے پروفیسر خواجہ سعید کمالات کی باریکیوں کی اپنی مٹی کے آئینے میں ایک اور شان دینے والے ڈاکٹر سلطان چاروں طرف گورنمنٹ کالج کی وابستگیوں میں پھیل کر انتظام وانصرام کی ارفع صفات کا مالک پروفیسر نواز۔ شاعر مشرق علامہ اقبال کی عظمتوں کو اور عظیم بنانے والے پروفیسر محمد منور۔ گورنمنٹ کالج کی علمی وادبی خدمات کو اپنا تخلیقی منظر نامہ بنانے والے پروفیسر جیلانی کامران یہ سب تھے اور بھی تھے کہ ڈاکٹر نذیر ہر کسی کو اس کی صفات کی خبر دینے والے تھے۔ اور ان کی بڑائیوں کو سب سے پہلے دیکھ لینے والے تھے۔ ان جیسا حوصلہ افزائی کرنے والا کم دیکھا۔ ایک نوجوان استاد اور اچھے شاعر علاؤالدین کلیم مرحوم کی غزل راوی میں پڑھ کر اسے داد دینے کمرہ جماعت میں جا پہنچے طالب علم خواجہ ذکریا کی غزل مجلس اقبال میں سن کر اپنے گھر چائے پر بلالیا۔ ایسے سینکڑوں واقعات کالج کیمپس میں چلنے والی ہوا کے لبوں پر لکھے ہوئے ہیں۔

اس زمانے میں طالب علموں کا بھی بڑا زمانہ تھا اور سات کی فہرست چھوٹی بہرحال ایک خوبصورت ماحول کی آزادی میں مہکتا ہوا سلسلہ تھا جو ایک تسلسل میں چلا رہا ہے۔ کہیں کہیں قافلے رک بھی گئے مگر زیادہ دیر تک اس بہاؤ کو روک نہیں سکا کوئی میں نے اس وقت کو ذہن میں رکھ کر سات سات طالب علموں کو سات حصوں میں تقسیم کر دیا ہے ان نوجوانوں کا علم وادب کیسی نہ کسی حوالے سے ربط بنتا ہے۔ کیا کیا جوان تاریخ کے اس لمحے کی آنکھ میں چمک چمک گیا۔ سچ ہے کہ سچا استاد وہ ہے جو طالب علموں کے دلوں میں زندہ ہوں اور ان کے ذہنوں میں بیدار رہے۔ پہلی فہرست نوجوان شاعر و ادیب استادوں کی ہے۔ دوسری ادیب و شاعر دوستوں کی ہے اب جو ایس پی افسر ہیں۔ تیسری جو اب ٹی وی کے پرڈیوسر ہیں۔ چوتھی مختلف شعبوں میں ملازم شاعروں ادیبوں کی پانچویں ادب دوست افسروں کی چھٹی متفرق میدانوں میں کامیابیاں حاصل کرنے والوں کی۔ ساتوں طالبات میں سے اہم ناموں کی یہ سب لوگ میرے زمانے کے لوگ ہیں۔‘‘

منیز احمد شیخ ڈاکٹر صفدر محمد ڈاکٹر لئیق بابری علاؤالدین کلیم خالد احمد انوار ادیب مرحوم' راحت نسیم ملک' طارق محمود' آفتاب احمد شاہ' سہیل صفدر' شہزاد قیصر' وحید رضا بھٹی' سرمد صہبائی' محمد انور' اختر وقار عظیم' مشتاق صوفی' شاہد محمود ندیم' اشرف عظیم' اطہر وقار عظیم

خالد ابراہیم مرحوم' نصرت علی' ناصر کاظمی' یعقوب ناسک' سعید شیخ

سعادت اللہ خان، شاہد رفیع، اظہر حسن ندیم، ظہور الحق شیخ، ریاض احمد، شمس الحسن مرزا، ذوالفقار شاکر۔

محمود شام، اسد اللہ غالب، جاوید احمد القادری، سراج منیر، رشید عمر تھانوی، شاہد ملک، ممتاز اقبال ملک۔

نوید رحمان، نگار احمد، کشور عبیدہ اعظم

ڈاکٹر نذیر نے گورنمنٹ کالج کی فضاؤں کو ایک خوش فکر حریت سے ہمکنار کیا۔

یہاں بے کنار کا لفظ بھی مناسب ہوگا۔ کثیر اور دقیع تخلیقی سرگرمی ایسے ہی دنوں میں ہوتی ہے جب ہر ایک کو اپنے ہونے کا احساس ہوتا ہے۔ ان دنوں میں ہر کسی کو اپنے رستے پر اپنے انداز میں وہ کچھ کرنے کا حق تھا جو وہ کر سکتا تھا جو وہ کرنا چاہتا تھا۔ گویا گورنمنٹ کالج میں کئی گورنمنٹ کالج کھلے ہوئے تھے۔ بدنظمی نہ تھی گڑبڑ تھی۔ ایک میلہ سا لگا ہوا تھا جو کبھی کبھی ہنگامے کی شکل میں بھی دم بھر کر ڈھلتا ہوا محسوس ہوتا۔ یہ ہنگامہ پھر میلے کی گہما گہمی اختیار کر لیتا۔ بہت سرگرمیاں تھیں ان دنوں سال میں "راوی" کے چار بڑے شمارے شائع ہوتے تھے۔ گزٹ باقاعدہ رسالہ تھا۔ کوئی دن ایسا نہ تھا جب کوئی نہ کوئی فنکشن نہ ہوتا ہو۔ مجلس اقبال، پنجابی مجلس اور سوندھی ٹرانسلیشن سوسائٹی کی ہفتہ وار نشستیں تو ہوتی ہی تھیں۔ یہ سب کچھ شام ہو ہوتا تھا۔ کالج شام کو زیادہ آباد ہو جاتا کرتا۔ کچھ پروفیسر بھی آتے۔ ڈاکٹر نذیر بھی آتے تھے نہیں آتے تھے تو لڑکے ان کو پکڑ کر لے آتے تھے۔ یوں بھی ہوا کہ ڈاکٹر صاحب نے پنجابی مجلس کے اجلاس کی صدارت کرنی ہوتی لوگ مگر وہ کرکٹ کھیلنے میں مصروف ہوتے پتہ چلتا کہ لڑکے ضد کر کے انہیں لے گئے تھے اور باقی سب کچھ وہ بھول گئے ڈاکٹر صاحب کو کھیل کے میدان سے اغوا کر کے ادبی محفل میں لایا جاتا تو میدان کی دھول اور محفل کی خوشبو ایک وجود میں اکٹھی ہو جاتیں دانش ان کی زبان سے نکل کر لوگ دانش بن جاتی تھی۔ وہ موسیقی کے نہ صرف دلدادہ تھے بلکہ ماہر بھی تھے۔ میدان کہیں بھی تیار ہوا ہو ڈاکٹر صاحب ہر کہیں مرد میدان تھے۔ سائنس کے استاد کے لیے اتنا آسان نہیں ہوتا کہ وہ سپورٹس، موسیقی اور شعر و ادب کو اپنا خاص مشغلہ بنائے اگرچہ ڈاکٹر نذیر زندگی کو خاص میدانوں میں مقید نہ کرتے تھے۔ ان کا ہر عمل عام حیثیت اختیار کر لیتا تھا۔

کم کم استادوں کو طالب علموں کے دلوں میں اتنی جگہ ملی ہوگی۔ گورنمنٹ کالج کے لڑکوں کو ان سے اتنی محبت تھی کہ ساری فضا اس جذبے میں نہائی ہوئی دکھائی پڑتی۔ اعتراض کرنے والوں نے اسے سستی شہرت کہہ کر اپنے حسد کو ہوا دی۔ مگر قوم معترضین کے معززین کبھی کسی قیمت پر ایسی عزت نہ پا سکے۔ ایسی مثال نہیں کہ کبھی کسی طالب علم نے ڈاکٹر نذیر احمد کو دھوکہ دیا ہو ان کے ہوتے ہوئے طالب علم ہونا ایک اعزاز بن گیا تھا اس کا مطلب ہے کہ طالب ہونا ایک اعزاز ہے۔ انار کلی بازار میں اور مال روڈ پر لڑکے

ڈاکٹر صاحب سے اپنے کاغذوں پر دستخط کرا لیتے تھے کسی نے غلط دستخط نہیں کرائے۔ مجھے اس وقت کے سب نوجوانوں کی طرح فخر ہے کہ میں گورنمنٹ کالج کا طالب علم تھا۔اس وقت تھا جب ڈاکٹر نذیر کی ایک عظیم باپ کی حیثیت میں موجود تھے۔ مجھے گورنمنٹ کالج میں پرنسپل کی نشست پر بیٹھا ہوا ہر آدمی اچھا لگتا ہے کہ وہاں ڈاکٹر نذیر کی تصویر لگی ہوئی ہے۔

مجھے یاد ہے کہ میرا بھائی' میرا کلاس فیلو اصغر نیازی بیمار ہوا تو ڈاکٹر صاحب بھاگتے ہوئے نیو ہوسٹل پہنچے اور خود اسے گنگا رام ہسپتال لے کر گئے ڈاکٹروں نے سمجھا کہ یہ ڈاکٹر صاحب کا بیٹا ہے اس کے صحت یاب ہونے تک یہ تاثر ٹوٹا نہیں۔ دلوں پر تو بعد میں بھی قائم رہا۔کالج کا ہر طالب ان کا بیٹا تھا۔اتنی بڑی تعداد کے کالج میں ہر طالب علم سمجھتا تھا کہ ڈاکٹر صاحب اس کے ساتھ سب سے زیادہ شفقت کرتے ہیں۔لڑکے ان کو ہوسٹل میں لے جاتے اور وہاں موجود ہر طالب علم کی خواہش ہوتی کہ ڈاکٹر صاحب ان کے ساتھ کھانا کھائیں ڈاکٹر صاحب یہ تو نہ کر سکتے تھے مگر انہوں نے کبھی کسی طالب علم کو ناراض نہ کیا۔ نہ لڑکوں نے کبھی نہیں ناراض ہونے دیا۔میں نے ان کو کرکٹ میچ جیتنے پر لڑکوں کے کندھوں پر بیٹھے ہوئے ناچتے بھی دیکھا۔تب اسلامیہ کالج کے ستھ یہ میچ بہت حساس ہوتا تھا تھا ہارنے کی صورت میں ڈاکٹر صاحب ٹیم کے کپتان سے زیادہ سوگوار ہو جاتے۔بعض اوقات جھگڑے کی صورت میں ڈاکٹر صاحب بھی زخمی ہو گئے۔

ایسے میں وہ گورنمنٹ کالج اور اسلامیہ کالج کے لڑکوں میں کوئی فرق نہ کرتے تھے۔ بڑی وسعتیں تھیں ان کے پاس اور وہ رنگ رنگ کی تھیں وہ درویشی کی فطرت کے مالک تھے۔ان کی درویشی اس طرح کی نہ تھی جس طرح ہم کتابوں میں پڑھتے ہیں۔سچا درویش اپنی طرز کا واحد درویش ہوتا ہے۔ورنہ درویشی بھی سلطانی کی طرح عیاری ہی ہے۔وہ ایک سچے لبرل تھے۔ڈاکٹر صاحب نے ٹھونسا نہیں کبھی اپنے آپ کو اپنے اور طالب علموں کے درمیان فاصلے کو ایک غیر محسوس طریقے سے ختم کیا۔ایک پکا رشتہ جو روایتی قسم کی رشتہ داری کی ذیل میں نہیں آتا۔ وہ لڑکوں کے ساتھ مل کر جلوس نکالنے سے بھی نہیں کتراتے تھے مگر یہ بھی ہوا کہ جلوس ریگل چوک پہنچ گیا اور ڈاکٹر صاحب کو ریڈیو سٹیشن پر اطلاع ملی کہ ہنگامہ ہو گیا ہے۔انہوں نے یہ تو کبھی نہ چاہا تھا کہ بچوں کا نقصان ہو اور انہیں لوگ برا کہیں۔ وہ ریگل چوک پہنچے ایک طرف صدر یونین اور دوسری طرف پرنسپل صاحب۔ دونوں نے تقریریں کیں۔نتیجہ یہ نکلا کہ ڈاکٹر صاحب لڑکوں کو لے کر واپس کالج آ گئے۔اب اکیلا طالب علم لیڈر اسمبلی ہال جا کر کیا کرتا وہ بھی سر جھکائے پیچھے پیچھے ہولیا۔ سچے استاد سے بڑا لیڈر کون ہو سکتا ہے۔انہوں نے طالب علموں کے دل میں چھپے ہوئے لیڈر کو ہمیشہ خوش آمدید کہا مگر لیڈری کا مطلب غنڈہ گردی نہیں۔اصل لیڈر اور حاکم ڈاکٹر نذیر ایسا استاد ہوتا ہے۔یہ راز ایک جابر حکمران ملک امیر محمد کو بھی معلوم ہو گیا تھا جب ڈاکٹر نذیر کو گورنمنٹ کالج سے تبدیل کیا گیا تو ہڑتال ہو گئی۔حالانکہ گورنمنٹ کالج میں ہڑتال شاذ و نادر ہی ہوتی ہے۔ایسے واقعے یہاں نہ

ہونے کے برابر ہیں اور شاید یہی ایک آرڈر تھا جو نواب کالا باغ اپنی گرونری کے دوران واپس لیا۔ وہ بعد میں ڈاکٹر صاحب سے ملنے کی خواہش کرتا رہا مگر ڈاکٹر صاحب اس کے پاس نہ گئے۔ ایک بار اتفاقاً ایک فنکشن میں اکٹھے ہو گئے تو گورنر خود ڈاکٹر صاحب کی طرف آیا اور گلہ کیا۔ تو ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ آپ حاکم ہیں ایک فقیر استاد۔ ہماری ملاقات کی کوئی تک نہیں۔

ریٹائرمنٹ کے بعد ڈاکٹر صاحب نے پیکو میں پنجابی صوفی شعرا کے کلام کی اشاعت و تدوین کے لیے یادگار کام کیا۔ ان کی تحریریں سادگی اور گہرائی کا انوکھا امتزاج ہیں کتاب اور سائیکل سے ان کا رشتہ عمر بھر قائم رہا۔ مگر آخر آخر عمر وہ جیسے تھک گئے تھے ڈاکٹر صاحب کے لباس گفتگو اور انداز و اطوار سے ظاہر نہ ہوتا تھا کہ وہ کوئی بڑے آدمی ہیں کسی کی طرف سے اپنے لیے ایسے اظہار کو بھی پسند نہیں کرتے تھے۔ وہ واقعی بڑے آدمی تھے ایک دن حسب معمول اپنے گھر سے سیکرٹریٹ جانے کے لیے بس میں سوار ہوئے بس میں بیٹھنے کو جگہ نہ تھی اور وہ کھڑے ہو گئے وہ اپنے لیے کسی کو جگہ نہیں چھوڑنے دیتے تھے۔ کوئی اولڈر اوین ایسا کرا تو بیٹھ جاتے۔ ایک بار میں بھی ان کے لیے جگہ نہ بنا سکا کہ میں بھی کھڑا تھا اور انہوں نے مجھے کسی کو بھی یہ نہ بتانے دیا کہ بیٹھے لوئے لوگو دیکھو کون آدمی کھڑا ہے اور تم اور تم اس کا یقین بھی نہ کرو گے پھر جب کبھی میں بس میں بیٹھ کر کہیں گیا تو مجھے خود سے شرم آئی۔ ہمیں معلوم نہیں کہ ہم کسی چیز کے مستحق ہیں اور کس چیز کے نہیں۔

موت سے ذرا پہلے میو ہسپتال میں جب کوئی ان سے ملتا اور چادر میں لپٹے ان کے پاؤں چھوتا تو وہ ٹانگیں سکیڑ لیتے۔ کیا یہ میرا اعزاز نہیں کہ میں نے ان کے پاؤں پر ہاتھ رکھا تو ان کی بجھتی ہوئی آنکھوں میں کوئی گمشدہ روشنی سی کانپ گئی۔ میں دیر تک ایک عظیم باپ کا نقش پا بنا کھڑا رہا۔

◆◆◆

علم کا عالم حیرت

میں لاہور آیا تو سب سے پہلا دروازہ گورنمنٹ کالج میں کھلا اس دہلیز سے پہلا شخص جو نظر آیا وہ ڈاکٹر نذیر تھے شام ہوئی تو نیو ہوسٹل پہنچے وہاں مرغوب اندھیروں میں ڈاکٹر محمد اجمل دکھائی دیے مرد قلندر تھے ڈاکٹر نذیر مرد درویش ہیں ڈاکٹر اجمل ان کی شخصیت میں کوئی عمومیت تھی جو عوامیت بن گئی ان کی ذات میں ایک خصوصیت ہے جو خواصیت بن گئی ہے۔

ڈاکٹر اجمل ہماری علمی وادبی تاریخ کے معدودے چند بڑے آدمیوں میں سے ایک ہیں وہ بین الاقوامی رتبے کے انسان ہیں کسی براہ راست جملے سے کام چلانا برانداز نہیں مگر اس طرح بھی میں اپنا تاثر بیان نہیں کر سکا۔ دانشور کا لفظ ڈاکٹر صاحب کے لیے اپنے پورے پورے معنی دیتا ہے ورنہ ہمارے ہاں یہ لقب خاصا بے وقیر ہو چکا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا ہمنام ہونا اور ان سے ہمکلام ہونا میرا اعزاز ہے۔ قطب البلاد لاہور ایسا شہر ہے جو ہر زمانے میں کچھ لوگوں کو اپنے ہاں بلا لیتا ہے لاہور کی ساری زندہ روایات ان لوگوں نے تخلیق کی ہیں جو دور دور سے یہاں چلے آئے۔ ان سب لوگوں کے نام گونانا اس وقت ضرور نہیں ان لوگوں کی صف اول میں ڈاکٹر صاحب بھی ہیں۔

بڑی بڑی بلکہ گہری گہری آنکھوں والے اس شخص کو دیکھ کر لگتا ہے کہ یہ وہ بھی دیکھ لیتا ہوگا جو دوسرے نہیں دیکھ سکتے۔ جیسے یہ شخص دیکھنے کے علاوہ کوئی اور کام ہی نہیں کر سکتا۔ جب انہوں نے بولنا شروع کیا تو محسوس ہوا کہ ان کی آواز بھی دیکھ رہی ہے میں نے اتنا پر سکون آدمی کم کم دیکھا ہے۔ پر سکون آدمی سے زیادہ مضطب آدمی کون ہوتا ہے۔ بس وہ اپنے اضطراب پر قابو پا لیتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے کبھی اضطراب کے لبالب پیمانے کو چھلکنے نہیں دیا اس طرح کی سرمستی ان کے سراپے میں ہے جیسے بہت دنوں کے جاگے ہوئے ہوں۔ ایک سوتی ہوئی سی کیفیت ان کے لب ولہجے میں جاگتی رہتی ہے۔ عجب کشش ہے جو ان کے اردگرد مسلسل دائرے بناتی رہتی ہے۔ وہ عام باتیں کر رہے ہوں تو بھی لگتا ہے بہت بڑی بات ہو رہی ہے۔''

میری طرح ڈاکٹر صاحب آرام پسند آدمی لگتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ میں کاہل آدمی ہوں وہ بحر الکاہل ہیں۔ بحر الکاہل کی مثال ڈاکٹر صاحب کے لیے بہت برمحل اور برحق ہے۔ تخلیق وتہذیب کا سمندر ان کے اندر ہے سمندر جیسا آدمی مگر جیسے ساحل پر کھڑا ہوا۔

ڈاکٹر صاحب سے مل کر دل ہمیشہ متحیر ہوا۔ اتنا کاہل آدمی اور اتنا کامل آدمی سائیکالوجی کے شعبے میں نیو ہوسٹل کے سپرنٹنڈنٹ کے طور پر گورنمنٹ کالج کے پرنسپل کے دفتر میں' پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر کی حیثیت سے مرکزی سیکرٹری تعلیمات کے عہدے پر ملک کے باہر مختلف علمی مقامات پر کہیں بھی ڈاکٹر اجمل کی شخصیت میں اتار چڑھاؤ نہیں دکھائی دیا۔ وہ جو اپنی ذات میں ہیں اسی طرح اپنے زمانے میں ہیں۔

عجب مستحکم مزاج ہے ان کا کچھ بھی ہو گیا انہوں نے اپنی پریشانیوں مایوسیوں اور بے چینیوں کا پتہ نہیں چلنے دیا۔ ایسا نہیں کہ ہر کوئی دروازہ کھول لے اور دیکھ لے کہ اندر کیا ہو رہا ہے میرا خیال ہے کہ جو کچھ باہر ہو رہا ہے اسے ٹھیک ٹھیک دیکھنے کے لیے بھی یہی دروازہ کھولنا پڑتا ہے۔

حسن عسکری نے کہا ہے کہ پاکستان میں کوئی نفسیات جانتا ہے تو وہ ڈاکٹر اجمل ہیں۔

اس ایک فقرے میں عسکری صاحب نے بہت کچھ کہہ دیا ہے۔ کسی شے کی اصل جاننے کے لیے اس راہ سے گزرنا ضروری ہے ڈاکٹر صاحب اس راہ کے سچے اور بڑے مسافر ہیں۔ منزلوں سے پیشتر ہی منزلوں کا سراغ لگا لیتے ہیں۔ انسانی اور قومی نفسیات کے علاوہ ہر علم کی بھی ایک نفسیات ہوتی ہے۔

ایک دفعہ میں نے ڈاکٹر صاحب سے پوچھا۔ ''آج کل آپ کے شب و روز کیسے گزر رہے ہیں۔''

کہا کہ ''راتیں تو رومی کی صحبت میں گزر رہی ہیں۔ دن پتہ نہیں کس کے ساتھ گزر جاتا ہے۔''

انہیں نہ دن کی پرواہ ہے نہ کسی کی۔ ایک شکایت ہے ڈاکٹر صحب سے تب بھی اور اب بھی انہوں نے اتنا پڑھا ہے کہ جس کا جو جی چاہے اندازہ لگا لے مگر انہوں نے لکھا بہت کم ہے۔ بہت ہی کم وہ بھی ان سے لکھوایا گیا ہے میں جب ''راوی کا مدیر تھا'' تو ان سے ایک مضمون لینے کے لیے کئی ملاقاتیں ان سے رہیں اور یہی میں چاہتا تھا ''وقتاً فوقتاً'' گفتگوئیں انہوں نے میرے ساتھ کیں ان کا خلاصہ بھی میں اپنی یادداشت کے مطابق لکھ دوں تو ایک کتاب تیار ہو جائے۔''

پڑھے لکھے لوگ بالعموم پڑھے کم اور لکھے زیادہ ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کا معاملہ برعکس ہے۔ ان کے مقالات ادھر ادھر جگنوؤں کی طرح بکھرے ہوئے تھے شیما مجید نے چراچرا کے اپنی ضدی جستجو کے آنچل میں باندھ لیے اور نسراج منیر نے انہیں ہمارے تہذیبی تخلیقی منظر کی منڈیر پر چراغیوں کی طرح سجا دیا ہے۔''

ڈاکٹر صاحب سے مکالمہ کرنا اور ان کا مطالعہ کرنا دونوں فکر انگیز عمل ہیں۔ ان سے مکالمہ کرنا کچھ زیادہ نشاط انگیز ہے۔ ان سے

گفتگو کے دوران پرانی جگہوں پر نئے قطار اندر قطار بکھرتے چلے جاتے ہیں۔ تازہ خیالات میں بھولی ہوئی حقیقتوں کا رنگ گھلتا جاتا ہے۔ ان کی باتوں میں علوم کئی تہذیبی امکانات اور باطنی کیفیات کی روشنی میں ظاہر ہوتے ہیں۔ وہ سگریٹ پیتے پیتے بات کرنے لگیں تو سگریٹ ان کے نچلے ہونٹ کے ساتھ ٹک جاتا ہے اور نہیں گرتا۔ وہ اپنے کسی خیال کو بھی لفظوں کے درمیان گرنے نہیں دیتے اور ان کا مخاطب بھی توجہ کے مدار سے کھسکنے نہیں پاتا۔ انہوں نے مکالمے مطالعے اور مراقبے کے فرق کو کم کر دیا ہے۔ اس طرح داخلی خارجیت کا ایک منفرد اسلوب دریافت ہوا ہے۔

ڈاکٹر صاحب مغربی مفکرین میں ژنگ کے ''دوست ہیں'' کتاب انہوں نے سقراط پر لکھی ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے بھی وہ کام جی بھر کے کیا ہے جو سقراط کرتا رہا۔ ہر زمانے میں معاشرہ اپنے اعلیٰ آدمی کی قدر نہیں کرتا۔ ڈاکٹر صاحب نے ول ڈیواروں کی کتاب کا ترجمہ کیا ہے ''نشاط فلسفہ'' سچی نشاط فلسفیانہ اسلوب خیال میں ہے۔ گہرا اسلوب زیست بھی اسی رویے سے پھوٹتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب ایسا آدمی مدتوں میں پیدا ہوتا ہے ہم کنگال آدمی اتنی کتابوں کے نام بھی نہیں جانتے جو وہ کھنگال چکے ہیں۔ کچھ لوگ پڑھنے اور سوچنے کے لیے پیدا ہوتے ہیں۔ ان کے پاس بیٹھ کر پندرہ منٹ کی گپ شپ میں وہ کچھ مل جاتا ہے جو پندرہ سالوں کی پڑھائی میں نہیں ملتا۔ ڈاکٹر صاحب کبھی پاکستان میں فلاسفی آف ایجوکیشن پہ کچھ لکھیں تو یہ ساری دنیا کے لیے ایک تحفہ ہو۔ ذوق و آگہی کا درد رکھنے والوں کے لیے ان سے ملنا ضروری قرار دے دینا چاہیے۔

ڈاکٹر صاحب اشرف علی تھانوی کے عاشق ہیں۔ محمد حسن عسکری سے ان کی دوستی علمی رغبتوں کا ثمر تھی۔ انہوں نے ایک مضمون جواں سال جدید افسانہ نگار خالدہ حسین کے بارے میں لکھا ہے۔ ان کی نظر تینوں زمانوں کے رستوں پر ہے۔ ماضی حال اور مستقبل کا سہ حدہ ان تک پہنچتے پہنچتے ایک نقطہ بن جاتا ہے۔ انہوں نے قدیم و جدید شعر و ادب کو اس طرح نہیں پڑھا جس طرح میں نے پڑھا ہے۔ ہم نے پڑھا ہے۔ وہ کسی ادیب کے بارے میں بات کرتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ ہم کسی علاقے میں دوسری بار جا رہے ہیں لیکن پہلے ہم اس رستے سے نہ گئے تھے۔ انہیں سن کر حیرت آدمی کے اندر تڑپتی ہے ان کی شخصیت میں ایک انوکھی محبوبیت کی بازگشت ہے۔ وہ چھا جانے کا ایک مانوس ہنر رکھتے ہیں۔ ایک بے نیاز صوفی کی طرح انہوں نے اپنے ذہن اور دل کو بیک وقت استعمال کرنے کی فطرت پر قابو پا لیا ہے۔ عسکری صاحب اور ڈاکٹر اجمل جب مذہب کی حقیقتوں کو بیان کرتے ہیں تو ایمان بالغیب اور حق الیقین کی منزلیں جانی پہچانی نئی لگتی ہیں۔''

ہم اپنے آپ کو ذات کی خالی جگہوں میں چھپائے رہتے ہیں۔ کسی اہل دل اور صاحب دماغ سے ملیں تو یہ ویرانیاں کشادگیوں

میں بدل جاتی ہیں۔ہم اپنی چیزوں کو حصر سمجھنے کی کوشش میں مبتلا ہیں۔کسی اشارے کی دیر ہوتی ہے کہ عظمتوں کے بھولے بسرے سچے رنگ ہماری آنکھوں میں جگ مگ جگ مگ کرنے لگتے ہیں۔پاکستان ٹیلی وژن لاہور کے ایک پروگرام''نواں رنگ'' میں میرے ایک سوال کے جواب میں ڈاکٹر اجمل نے کہا کہ

''میں خواجہ فرید کو دنیا کا سب سے بڑا شاعر سمجھتا ہوں۔''

تو میں ان کے سامنے روہی کے صحرا کی طرح دم بخود رہ گیا۔پیر فرید جو یار فرید بھی ہے ان کی کافیاں میری جدائیوں اور تنہائیوں کی سہیلیاں' مگر میں انہیں صرف ایک دردمند شاعر ہی جانتا تھا اب جو فرید کو پڑھا تو اس نے مجھے پاگل کر دیا اور مجھے منیر نیازی یاد آیا۔

جیہڑیاں تھانواں صوفیاں جا کے لٹیاں مل
اوہ اوہناں دے دردی تاب نہ سکیاں جھل
اکو کوک فرید دی سنجھے کر گئی تھل

منیر نیازی کی اس لازوال نظم کا عنوان''اسماناں دے ویکھن والیاں دا ورد'' ہے ہمارے صوفی شاعروں نے اپنی دھرتی کی خاک میں اپنے آسمان کا عکس کھوج لیا ہے یہی کمال انہیں ایرانی صوفی شاعروں سے مختلف کرتا ہے ممتاز بھی کرتا ہے۔ڈاکٹر اجمل نے بھی اپنی خاک میں چھپنے جہانوں کا ادراک پا لیا ہے۔خمیر اور خاک مختلف عنصر تو نہیں ان کے باطن میں جتنے رنگ ہیں وہ سب کس نے دیکھے ہیں۔ان میں سے کئی رنگ ان لفظوں نے پہن لیے ہیں جو صوفی شاعروں اور صوفی دانشوروں کے حوالے سے ہم تک پہنچے ہیں۔

ایک زمانے میں شاعری بھی کی ڈاکٹر صاحب نے۔اگر وہ شاعری کرتے رہتے تو تو میں پیشین گوئی اور پر گوئی سے گھبراتا بہت ہوں۔ہر کسے را بہر کارے ساختند ڈاکٹر صاحب نے تو نثر میں بھی وہ نہیں لکھا جو ان کے لوح دل پر لکھ دیا گیا ہے۔لوح دل اور لوح محفوظ پر لکھی ہوئی باتیں ایک سی بھی ہوتی ہیں۔انہیں لوح خاک پر لکھنے کی اجازت کسی کسی کو ملتی ہے مگر ڈاکٹر اجمل تو اجازت کے بعد بھی لکھنے سے کترا رہے ہیں۔کبھی اپنی اس کیفیت کا تجزیہ بھی کیا انہوں نے''یہ سوال نہیں مگر سوال کے بغیر بھی جواب دینا فرض ہوتا ہے کچھ لوگوں کا کہتے ہیں ہمارے گفتگو اور عمل سب فضاؤں کی آنکھوں میں درج ہو رہے ہیں۔یہ کائنات جیسے کوئی رجسٹر ہے آنے والے وقتوں کے لوگ شاید اس پر بھی قادر ہوں کہ انہیں ریکارڈ محفوظ کر لیں۔باتیں اور تصویریں کسی ایسے علاقے میں محفوظ ہو رہی ہیں

جوان دیکھا سنا ہے۔

ایک زمانے میں شاعری بھی کی ڈاکٹر صاحب نے۔ اگر وہ شاعری کرتے رہتے تو قیس پیشین گوئی اور پر گوئی سے گھبراتا بہت ہوں۔ ہر کسے را بہر کارے ساختند ڈاکٹر صاحب نے تو نثر میں بھی وہ نہیں لکھا جوان کے لوح پر لکھ دیا گیا ہے۔ لوح دل اور لوح محفوظ پر لکھی ہوئی باتیں ایک سی بھی ہوتی ہیں۔ انہیں لوح خاک پر لکھنے کی اجازت کسی کسی کو ملتی ہے مگر ڈاکٹر اجمل تو اجازت کے بعد بھی لکھنے سے کترا رہے ہیں کبھی اپنی اس کیفیت کا تجزیہ بھی کیا انہوں نے؟ یہ سوال نہیں مگر سوال کے بغیر بھی جواب دینا فرض ہوتا ہے کچھ لوگوں کا کہتے ہیں ہمارے گفتگو اور عمل سب فضاؤں کی آنکھوں میں درج ہو رہے ہیں۔ یہ کائنات جیسے کوئی رجسٹر ہے۔ آنے والے وقتوں کے لوگ شاید اس پر بھی قادر ہوں کہ انہیں ریکارڈ محفوظ کر لیں۔ باتیں اور تصویریں کسی ایسے علاقے میں محفوظ ہو رہی ہیں جوان دیکھا ان سنا ہے۔

ڈاکٹر صاحب کی باتیں مجھے بہت یاد ہیں مگر میں کوئی ایسی کتاب نہیں لکھ سکتا جس پر ان کا نام مصنف کے طور پر لکھا ہو۔ جو باتیں ڈاکٹر صاحب نے کہیں انہیں ہم اسی طرح بیان کر دیں تو بھی وہ ان کی باتیں کب رہیں گی۔ یہ کمال صرف احادیث نبوی کو حاصل ہے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی باتوں کو ان کے صحابہ نے حرف بحرف یاد رکھا۔ اس کے باوجود حدیث کے حکایت بننے کے امکانات کو نہ روکا جا سکا۔ اسماء الرجال کا فن انسانی تہذیب کو اس رستے پر ملا مگر اس رستے پر چلنے والوں میں سے کئی ایک نے اپنی اپنی منزلوں کا غبار چاروں طرف اڑانے کی کوشش کی۔ بہر حال ہم احادیث کے مطالعے میں جذب ہو کر رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صحبت کا ترفع حاصل کر سکتے ہیں۔ اس میں عقیدے سے زیادہ عقیدت کی تاثیر بنیادی کردار رکھتی ہے۔ شاید میری باتوں نے اب ماورائی اور مابعد الطبعاتی کیفیات کے میدانوں کا رخ کر لیا ہے۔ ڈاکٹر اجمل کے کئی موضوعات انہی وسعتوں میں بکھر بکھر کر سمٹتے رہتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب ایک علمی شخصیت ہونے کے ساتھ ساتھ عملی آدمی بھی ہیں۔ کوئی کہے کہ یہ میں نے کیا بات کر دی ہے۔ مگر میں جانتا ہوں کہ کئی لوگ جو جسمانی اور روحانی جذباتی اور نفسیاتی عوارض میں جکڑے ہوئے تھے اور تقریباً لا علاج تھے ڈاکٹر صاحب کے ساتھ گفتگو کرتے کرتے ٹھیک ہو گئے ڈاکٹر صاحب کی باتیں اور نظریں کیا کیا طاقتیں رکھتی ہیں؟

''حالات عقل وعشق کی رہنمائی میں بدل سکتے ہیں۔''

اب جبکہ ڈاکٹر صاحب ریٹائر ہو چکے ہیں۔ لگتا ہے تازہ دم ہو گئے ہیں اور انہیں فراغتوں اور فرصتوں کے محکمے اہم عہدہ مل گیا ہے۔ دسمبر 86ء کے فنون کے شمارے میں ان کا ایک مضمون شائع ہوا ہے جس کا عنوان ہی ''ریٹائرمنٹ'' ہے یہ مضمون پڑھ کر میرا بھی

سے ریٹائرمنٹ لینے کو جی چاہ رہا ہے۔ اگرچہ ابھی میری آدھی ملازمت باقی ہے ڈاکٹر صاحب نے بظاہر ایک عام سے غیر علمی اور معمولی موضوع کو فطرت اور فراست ہمرنگ کر کے آفاقی اور عالمی مرتبے کا ادب بنا دیا ہے۔ یہ ایک ایسی تحریر ہے جو قاری کو نفسیات تنقید تحقیق اور دوسرے کئی شعبوں کی وسعتوں میں لے جاتی ہے مگر دل میں تخلیقی ترفع کی مشعل مسلسل جلتی رہتی ہے۔ امید ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی اور تحریریں بھی ان دنوں میں پڑھنے کو نصیب ہوں گی۔ ہمارے ہاں لوگ ریٹائر ہو کر موت کے منتظر ہو بیٹھتے ہیں مگر یہاں زندگی کئی زندگیوں کا روپ دھار کر ڈاکٹر صاحب کے روبرو کھڑی ہے۔ علم ذوق تجربہ تفکر تخیل' نفسیات جذبات شعور لاشعور اور کئی امکانات یکجان ہو کر لفظوں میں پوری طرح جذب ہوتے ہیں اور قاری کئی طرح کی سرشاریوں اور سرمستیوں سے ہمکنار ہوتا ہے آپ بھی تھوڑا سا حصہ لیجیے۔

''وقت ایک معمہ ہے جس کے متعلق مفکروں نے مختلف خیالات کا اظہار کیا ہے۔ مثلاً ''سیموئیل الیگزینڈ کہتا ہے کہ انسان کو چاہیے کہ وقت کو سنجیدگی کی نظر سے دیکھے۔ اس کے برعکس برٹرینڈ رسل کہتا ہے کہ وقت کی کوئی پرواہ نہ کرو۔ کیونکہ تم جتنا وقت کی طرف متوجہ ہو گے اتنا ہی زیادہ اپنے کام سے شغف کھو بیٹھو گے۔ جب وقت کی تلوار کاٹتی ہے تو اس کی برش ہمیں حوادث اور خارجی کے رحم و خرم پر چھوڑ دیتی ہے۔ اس سے کسی کو دور کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ تلوار کی کاٹ کے ساتھ ساتھ چلتے جاؤ تا کہ تم بھی تلوار بن جاؤ۔ تخلیقی کام کا بیڑا اٹھانے والا وقت سے نہیں ڈرتا کیونکہ بالعموم اس کے تخلیقی کام میں ماضی حال اور مستقبل ملے ہوئے نظر آتے ہیں۔ حالی نے کیا خوب کہا ہے کہ جب کوئی شروع کرو تو ہر سانس کو عمر جاودانی سمجھو جاودانی یا لازماں یا کا احساس بھی تخلیقی کام سے پیدا ہوتا ہے ایسے عالم میں بقول وایٹ ہیڈ ماسٹر ہر لمحہ جاودانی ہوتا ہے وہ تو یہاں تک کہتا ہے کہ لمحہ ہی جاوداں ہو سکتا ہے۔ صوفیا جب الازماں کا ذکر کرتے ہیں تو دراصل وہ شعور کی ایک اور سطح کا ذکر کر رہے ہوتے ہیں اس کا یہ مطلب ہے کہ شعور کی ایک سطح نہیں' اس کی سطح کئی سطحیں ہیں جسے ہم لاشعور کہتے ہیں وہ دراصل شعور ہی کی ایک سطح ہے اکثر و بیشتر ہم اپنی زندگیاں شعور کی روزمرہ کی سطح پر گزار دیتے ہیں اور دوسری سطحوں کی طرف متوجہ نہیں ہوتے لیکن جو لوگ جاں فشانی کے ساتھ اس کی جستجو کرتے ہیں تو دوسری سطحیں بھی ابھرتی ہیں اور وہ تجربات کو نئے سانچوں میں ڈھال دیتی ہیں اس سے زندگی میں روحانی پیدا ہوتا ہے۔ کسی صوفی نے کہا ہے کہ جو شخص محبوب کا نام سن کر رقص نہیں کرتا اس کا کوئی محبوب نہیں۔

یہاں پہنچ کر میرے دل نے رقص شروع کر دیا ہے۔ ورنہ میں ڈاکٹر صاحب کے اس اقتباس کو اور طویل کرتا۔ میں یہیں اپنی بات ختم کرتا ہوں کہ دوسرے پڑھنے والوں کے شوق رقص میں محل نہیں ہونا چاہتا۔

مگر نازم برین ذوقے کہ پیش یار می رقصم

◆◆◆

مختصر نویسی کا معجزہ

ایذرا پاؤنڈ نے کہا ہے کہ وہ مقناطیس کہاں چلا گیا ہے جو لوگوں کو اپنی طرف کھینچتا تھا۔ یہ گمشدگی ایک ہمہ گیر ضیاع کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ واصف صاحب نے وہ مقناطیس کہیں سے حاصل کر لیا ہے۔ یہ چیزیں کبھی کہیں سے مل ہی جاتی ہیں۔ اس کبھی اور کہیں کا کسی دوسرے کو پتہ نہیں چل پاتا۔ واصف صاحب کے اردگرد ایک خاص کشش کا دائرہ بڑھتا جاتا ہے ان کے لہجے میں ایک اجنبی جاذبیت ہے جو دلوں کو موڑ کے لے آتی ہے۔ ہمارے ہاں بات کرنے والا بڑا بڑا آدمی پڑا ہے۔ ڈاکٹر محمد اجمل اور اشفاق احمد دونوں کا انداز جدا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے ہاں فکر کی گہرائیاں ہیں۔ اشفاق صاحب فکری بات کو مزیدار بنا دیتے ہیں واصف صاحب کو بھی کرنے کا وجدان نصیب ہوا ہے وہ فکر کو ذکر میں بدل دیتے ہیں۔ واصف صاحب کے ہونے کی خبر ادبی حلقوں میں اشفاق صاحب نے سب سے پہلے کی۔

باتیں تقریر سے یکسر مختلف ہوتی ہیں۔ واصف صاحب تقریر نہیں کرتے۔ مکالے کو مشاہدے اور مشاہدے کو مکاشفے کا رنگ دیتے ہیں۔ کئی لوگ مراقبے کا لطف بھی اٹھا لیتے ہیں۔ اس طرح نظر نہ آنے والے منظر نظر آنے والی تصویروں میں آپ سے آپ ڈھلتے رہتے ہیں مختلف سوچوں، ارادوں آرزوؤں والے آدمی یہاں اپنے مطلب کی چیز منتخب کر لیتے ہیں۔ ہر شخص سمجھتا ہے جیسے کوئی صرف اسی سے مخاطب ہے۔ واصف صاحب وجدانی لہر میں بولتے ہیں۔ لکھتے بھی اسی ادا میں ہوں گے۔ وہ کچھ بولتے ہیں تو اسے ٹیپ ریکارڈ میں محفوظ کر کے مرتب کر لیا جاتا ہے۔

یہ ان کی گفتگو ہے جو کرن کرن سورج اور ''دل دریا سمندر'' کی صورت میں کتاب بن گئی ہے۔ ان کی باتیں سن کر لگتا ہے۔ جیسے خیال نے وصال پا لیا ہے۔ یہ ایک صاحب کمال شخص کا کلام ہے جو صاحب حال بھی ہے اور صاحب قال بھی ہے جیسے آرزو اور جستجو کو ایک ٹھکانہ مل گیا ہو۔

''کرن کرن سورج'' اختصار اور ارتکاز کا امتزاج ہے۔ فقرے اور مصرعے کا فرق مٹ گیا ہے۔ میرا دھیان خلیل جبران کی طرف جاتا ہے۔ وہ حکایت کہتے تھے۔ یہ حقیقت کہتے ہیں۔ اس حکایت میں حقیقت ظہور کرتی ہے۔ اس حقیقت میں حکایت چھپتی پھرتی ہے۔ بہرحال ایک بات پکی ہے کہ مختصر نویسی کے لیے کسی بھی اسلوب اور صنف کا انتخاب کیا جائے اور کوئی اس میں کامیابی

حاصل کرلے تو اس سے زیادہ وہ مثر اور مکمل اظہار کچھ اور نہیں۔ ہماری تحریریں فضول حرفوں کے انبار بنتی جارہی ہیں۔ جن میں کام کا لفظ تلاش کرنا مشکل ہوگیا ہے۔ بات کو غیر ضروری طول دنیا ہمارا مشغلہ بن گیا ہے۔ عشاء کی نماز کے بعد فجر کی اذان تک بولے چلے جانا کارنامہ سمجھا جاتا ہے۔ یہ کارنامہ ہے اگر بولنے والا عطاء اللہ شاہ بخاری کا ہمزاد ہو۔ مگر اب لوگوں کے پاس وقت نہیں اور لمبی تقریروں کا زمانہ لد گیا۔ گفتگو، بات چیت گپ شپ کو بہت پسند کیا جاتا رہا ہے ایسے میں کوئی جملہ کوئی نقطہ کوئی کنایہ سامنے والے آدمی کو ہلا دیتا ہے۔ اسے سرشار بھی کرسکتا ہے۔ اسے مسکرانے یا قہقہہ لگانے یا رونے یا سوچنے پر اکسا سکتا ہے۔ اس طرح کی باتھلمی بات میں ممکن نہیں۔ راز کی بات تفصیل سے نہیں ہوسکتی۔ راز تخلیق بھی ہوتا ہے راز فاش بھی ہوتا ہے۔ یہ دونوں اچانک ہوتی ہیں ہر آدمی کے پاس کوئی نہ کوئی راز ہوتا ہے جو کسی دوسرے کے پاس نہیں ہوتا۔ اسے دریافت کرنا پھر اسے بیان کرکے دوسروں کو اپنے اپنے راز کی خبر دینا ہر کسی کے بس کا کام نہیں۔ جب ہمراز رنگ بالمقابل آنکھوں میں چمک اٹھیں تو وہ حیران رہ جاتا ہے حیران ہونے سے زیادہ مستی والی حالت کوئی اور نہیں۔

جب کسی بیان میں کوئی لفظ زاید نہ ہو تو ہر لفظ گنجینہ معنی کا طلسم بن جاتا ہے۔ ایک پوری دنیا ایک پورے لفظ میں موجود ہوتی ہے۔ شرط یہ ہے کہ لفظ زندہ اور بیدار ہو۔ آج کے ادیب و دانشور کی زبان و قلم سے خفتہ اور مردہ لفظ چٹ کر رہ گئے ہیں۔ اس سب ذکر سے بہت آگے جو مثالیں خوبصورت پرندوں کی طرح اڑتی پھرتی ہے۔ ان میں احادیث رسول ایک محبوب یادداشت ہیں۔ حدیث مختصر گوئی کا اعلیٰ ترین نمونہ ہے۔ حضور سے زیادہ خوبصورت موثر مکمل اور بامعنی بات کرنے والا کوئی نہیں۔ ان کی باتوں کے ایک ایک لفظ میں زندگی کی تعبیر اور تقدیر اپنی ساری انتہاؤں اور ابتداؤں کے ساتھ موجود ہوتی ہے۔ اس کے بعد قائد اعظم کی تقریریں سنائی دینے لگتی ہیں۔ ان کے مٹھی بھر لفظوں میں ملت اسلامیہ اور برصغیر کے مسلمانوں کی تمناؤں کا جہان ابھرتا دکھائی دیتا ہے۔ سیاست دان لیڈروں کی لمبی لمبی تقریریں ان مختصر خطابات کے سامنے ہیچ ہیں۔ لفظ شناسی اور مردم شناسی ایک جیسے فن ہیں۔ واصف صاحب بھی ان فنون کو باریکیوں اور نزاکتوں سے خواب واقف ہیں۔ یہ مشکل کام ہے۔ محمد علی جوہر اپنے رسالے ''کامریڈ'' میں لمبے لمبے اداریے لکھتے تھے پوچھا گیا تو انہوں نے کہا کہ میرے پاس مختصر لکھنے کا وقت نہیں ہے۔ اس سے زیادہ مختصر نویسی کے کمال کی وضاحت ممکن نہیں کسی بات کی وضاحت میں مشکل پیش نہیں آتی خیالوں کے دریا بہانے سے دریا کو کوزے میں بند کرنا کہیں دشوار ہے۔ آدمی کا اندر تو سمندر ہے اسے لفظ و خیال کے کٹوروں میں ڈال کے سب کو تقسیم کرنا کہ ہر آدمی کو سب کچھ مل جائے گا۔ کوئی پیاسا نہ رہے اور کوئی ڈوب نہ مرے کتنا جان جوکھوں کا کام ہے۔ ایک ایک آیت اور ایک ایک حدیث بڑی بڑی حقیقتوں کا خلاصہ بن گئی ہیں۔ ایک طرح

سے مختصر گوئی سنت رسول ہے اور یہ وصف عشق رسول کی گہرائی میں میسر آتا ہے۔ واصف صاحب عشق کے نمائندے کے طور پر سامنے آئے ہیں۔

واصف صاحب نے شاعری بھی کی ہے۔ اس لیے وہ لفظوں کے بے دریغ اصراف کو اچھا نہیں سمجھتے۔ ان کے مجموعہ کلام ''شب چراغ'' کی روشنی تاریکیوں کو دوست بنانے کا ہنر عام کرنے والی ہے۔ انہوں نے مضامین بھی لکھے ہیں۔ واصف صاحب کی یہ تحریر مضمون کے علاوہ بھی کچھ ہیں۔ انہیں کسی ایک صنف سخن کے کمرے میں بند نہیں کیا جا سکتا۔ یہ بظاہر موضوعاتی مضامین ہیں مگر خیال موضوع سے بچھڑنے کے بعد بھی تاثر کی اکائی کو قائم رکھتا ہے۔ جس طرح دریا کا پانی سیلاب کی شکل میں کناروں سے بہت دور جا کر بھی دریا کا حصہ رہا ہے۔ ''مجھے کرن کرن سورج'' اور دل دریا سمندر ایک ہی سکے کے دو رخ نظر آتے ہیں جیسے کسی تصویر کو دو مختلف مقامات سے دیکھا جائے۔ لگتا ہے واصف صاحب بیک وقت کئی مقامات سے دیکھ رہے ہوتے ہیں۔ ''کرن کرن سورج'' کے چھوٹے چھوٹے جملے بڑے بڑے مضامین کو سمیٹے ہوئے ہیں۔ ''دل دریا سمندر'' کے مضامین ایک جملے کا پھیلاؤ ہیں۔

دائرہ جتنا بڑھ جائے مرکزی نقطہ محور سے جدا تو نہیں ہو سکتا۔ سمٹنا اور پھیلنا ہی فن کی رمز ہے کرن کرن مل کر سورج بنتی ہے۔ سورج کرن کرن میں بکھرتا ہے۔ دل ایک قطرہ ہے کبھی دریا کبھی سمندر دل دریا سمندروں ڈونگھے۔ میرے خیال میں کرن اور لہر میں کچھ فرق نہیں۔

واصف صاحب کے جملوں اور مضمونچوں میں اسلوب' تاثیر اور معنویت کے اعتبار سے بعد نہیں۔ واصف صاحب کوئی خبر دینا چاہتے ہیں۔ وہ اہل خبر میں سے ہیں او اہل خیر میں سے ہیں۔ ورنہ اب لوگ بری خبریں اڑانے میں لگے ہوئے ہیں۔ واصف صاحب نے خبر کو تخلیقی لہجہ دے کر خیال بنا دیا ہے۔ اس خیال میں اصل خبر ہے۔ سرسید کے مضامین یا آج کے انشایے میں خبر اور خیال دونوں نہیں۔ واصف صاحب ادیب شاعر کے علاوہ بھی کوئی رول رکھتے ہیں وہ اگر چاہتے تو بڑے آرام سے اپنی تحریروں کو کوئی نیا سا نام دے سکتے تھے اور لوگ بڑی خوشی اے اسے دل و جان سے تسلیم کر لیتے۔ مگر انہوں نے ایسا نہیں کیا۔

اکثر صوفیوں نے شاعری کو اپنے اظہار کا رستہ بنایا۔ کچھ نے نثر کا وسیلہ اختیار کیا۔ واصف صاحب نے یہ دونوں ذرائع اپنی صوابدادید پر رکھے ہوئے ہیں۔ وہ ایک درویش دانشور ہیں پڑھے لکھے اور فکر و درد والے کو بالکل الگ انداز میں اپنی جانب بلا رہے ہیں۔

انہوں نے نثر میں موجود رواج سے بالکل انوکھا ایک تخلیقی مزاج بنانے کی کوشش کی ہے ان کی باتوں پر اپنے بھید بھرے ہوتے

ہیں اسی طرح دوسروں کو اپنے اپنے بھولے ہوئے بھید بھی یاد آنے لگتے ہیں۔ باتیں تو بند دروازے کھولنے والی ہوتی ہیں۔ دہلیز کے اندر تو ہر کسی کا اپنا ہوتا ہے۔ یقین دلانے والی بات اتنی ہوتی ہے کہ یہ سب آپ کا ہے۔

واصف صاحب نے اس دنائی کے مشاہدات کو کسی اور دنیا کی کیفیات میں ملا کر ایک گہری دانائی کا پیکر تراشا ہے۔ قدیم زندگی کی روایت کو جدید دنوں کے اسلوب میں قابل قبول خوشبو عطا کر دی ہے۔ دولت شہرت کی دوڑ میں لوگ افراتفری اور نفسانفسی کا بری طرح شکار بنے ہوئے ہیں۔ ایسے میں انہیں اخلاص کی طرف آنے پر مجبور کرنا بلکہ مائل کرنا ایک خاص ڈیوٹی معلوم ہوتی ہے۔ مجبور کرنے اور مائل کرنے میں جو امتیاز ہے اسی میں واصف صاحب کے علمی وادبی طریق کار کی مزید پوشیدہ ہے۔ آج کے ماحول میں لوگ اس طرح کی باتوں کا مذاق اڑاتے ہیں کہ یہ کون سے جہان کی باتیں ہیں۔ انہیں دقیانوسی تصور کرتے ہیں۔ واصف صاحب نے منتشر سوچوں کو اپنے مطمئن ارادوں سے ہم آہنگ کر لیا ہے۔ یہ تخلیقی اور تحریکی کاروائی جدائی کے بعد وصال کے ایک واقعے کی طرح ہے۔ آج کل خواہشیں محرومیاں ارادے جذبے سب کچھ ہے مگر کوئی چیز واقعہ نہیں بن پاتی واصف نے صاحب نے زندگی کو اصل واقعے میں دیکھ لیا ہے۔ حقیقت ان کی سہیلی بن گئی ہے جبکہ سچائیوں کو انسانوں کا دشمن بنانے والوں نے اندھیر گردی مچا رکھی ہے۔

◆◆◆

ایک گھر کے دو راستے

یہ کم ہوا ہے کہ میاں بیوی دونوں کسی میدان میں نامور ہوئے ہوں اور انہوں نے اپنا اپنا مقام بنایا ہوا ایک دوسرے کے لیے مثال بن گئے ہوں۔ایک دوسرے کی مثا بن گئے ہوں بلکہ شال اور ڈھال بن گئے ہوں۔شال بانو قدسیہ کے سر پر اوڑھائی اشفاق احمد کے ہاتھ میں۔ یہ تو ہوا کہ خاوند یا بیوی کی وجہ سے دوسرے کو ملازمت مل گئی اور ترقی کے موقعے تحفے بن گئے یہ بھی ہوا کہ دو لکھنے والوں نے شادی کر لی مگر آگے چل کر راستے بدل گئے۔کوئی ایک بہت پیچھے رہ گیا یا کوئی آگے نکل گیا۔بیویوں میں تو اکثر لکھنا چھوڑ گئیں کچھ نے اپنے شوہروں کو چھوڑ دیا۔چند ایک نے بے چاروں کو کہیں کا نہ چھوڑا۔بہت کم ایسے جوڑے تھے جو ایک دوسرے سے جڑے رہے۔ایک دوسرے کی جڑیں کھوکھلی کرنے والے بھی ہیں۔اشفاق احمد اور بانو قدسیہ ایک سدا بہار مثالی جوڑا ہے سنا ہے یہ جوڑا آسمان پر بنتے ہیں۔ بھارت میں ایک آئیڈیل بیوی سے مل کر میں نے کہا تھا کہ تمہارے لیے پتنی کا لفظ کس قدر شاندار ہے رب نے کرایا ساڈا پتناں تے میل دے پتن زمین پر ہوتے ہیں۔اب تو بہت کم رہ گئے ہیں۔ ہر کہیں واٹر ورکس سکیم پہنچ گئی ہے۔ب بہت سوچنے والوں کی سکیمیں شروع ہوتی ہیں تو محسوس کرنے والوں کی اقلیمیں برباد ہو جاتی ہیں۔ترقی یافتگی میں وارفتگی زندہ رہنی چاہیے۔اشفاق احمد اور بانو قدسیہ کا نظریہ فن اسی لہر کے گرد گھومتا ہے۔

مغرب میں ازدواجی زندگی کا جو حشر ہوا وہ ہم اپنے ہاں برپا کر لینے کے لیے بے چین ہوئے جا رہے ہیں۔وہاں میاں بیوی اپنے حقوق کی جنگ لڑ رہے ہیں گھروں میں طبلہ بجتا ہے یا طبل بجتا ہے۔مغربی موسیقی کی کیفیت ہنگامے کی متبادل بنتی جا رہی ہے۔اب ان گھروں میں مار پیٹ کے واقعات عام ہو رہے ہیں۔مغرب میں شوہر اپنی بیویوں کو اکثر زدوکوب کرتے ہیں۔مشرق میں کبھی پہلے یہ وارداتیں عام تھیں۔جو کام ہم چھوڑ دیتے ہیں وہ شروع کر دیتے ہیں۔جو کام ان کے ہاں رک جاتے ہیں ہم انہیں نئے سرے سے اپنا لیتے ہیں ایک دوسرے کی پیروی کا یہ سلسلہ جاری ہے۔

میں آزادی نسواں کی مکمل حمایت کرتا ہوں مگر اس سے پہلے آزادی انساں کا مطالبہ کرتا ہوں۔

یہ سب باتیں مجھے الجھا رہی ہیں اور میں اشفاق احمد اور بانو قدسیہ کے لیے ایک مضمون لکھ رہا ہوں۔ان دونوں پر علیحدہ علیحدہ تحریریں بھی لکھی گئی ہیں مگر یہاں یہ احساس میرے لیے بڑی اور مردل کر جو اکائی بنتی ہے اسے محبت کا نام دیا جاتا ہے۔مقابلے کے

جنون نے ہم سے یہ لطف بھی چھین لیا ہے جب عورت اور مرد اپنے اپنے مقام کو جان لیتے ہیں تو صاحب مقام بن جاتے ہیں۔قدیمی چینی فلسفہ تاؤمت کے حوالے سے ایک دائرہ دو قوسوں سے بنتا ہے۔ایک فاعلی اور دوسری انفعالی ہوتی ہے۔دونوں کی وحدت اور یکتائی سے دائرہ وجود میں آتا ہے دائرہ چھوٹا بڑا ہوتا رہتا ہے۔قوسیں دو ہی رہتی ہیں۔انفعالی قوس میں ایک نقطہ علی قوس کا کہیں ہوتا ہے۔یہی حالت دوسری طرف ہوتی ہے ایک بڑا دائرہ بانو قدسیہ اور اشفاق احمد نے بنایا ہے۔اشفاق احمد میں بانو قدسیہ بانو قدسیہ میں اشفاق احمد رہتا ہے۔ممتاز مفتی نے ''اوکھے لوگ'' ہیں دونوں کا الگ الگ خاکہ لکھا ہے۔شاید ایک خاکہ دو بار لکھ دیا ہے۔بانو کے خاکے میں اشفاق اشفاق کے خاکے میں بانو کا ذکر زیادہ ہے۔بڑی تحریر ہے یہ اوکھے لوگ بڑے سوکھے لوگ ہیں۔وہ دونوں مختلف ہستیاں ہیں مگر ایک زندگی انہوں نے بسر کی ہے۔ایک دوسرے کی زندگی بسر کی ہے۔اس زندگی کا عنوان اشفاق احمد ہے اور خلاصہ بانو قدسیہ ہے۔اشفاق احمد مزاجاً کاہل آدمی ہیں۔جی رہے ہیں جیسے لیٹے ہوئے دھوپ سینک رہے ہوں۔انہیں تب خبر ہوتی ہے کہ دھوپ لگ رہی تھی جب بانو سورج اور ان کے درمیان آ کھڑی ہوتی ہے۔بانو کی چنری بھی ان کے لیے سیک کو مزیدار بنا دیتی ہے۔یہ ایک سچی ازدواجی زندگی کا منظر ہے اسے بانو نے منظرنامہ بنا دیا ہے۔

ادب میں بانو قدسیہ اور اشفاق احمد کا مرتبہ انیس بیس کا ہے۔بانو کہتی ہیں کہ بیس اشفاق احمد ہیں۔بہرحال مل کر انتیس بنتے ہیں۔دونوں نے فن و ادب کا کوئی میڈیا چھوڑا نہیں۔ڈرامہ افسانہ ناول سکرپٹ سفرنامہ فلم تھیٹر اور بہت کام اب وہ الگ سے بھی کوئی کام کرتے ہیں تو لگتا نہیں۔وہ اپنی یگانگتوں کو ظاہر ہونے سے بچاتے رہتے ہیں ان دونوں کو پانا مشکل ہے۔الگ الگ کر کے بھی سمجھنا مشکل ہے۔وہ دونوں مس انڈرسٹڈ مخلوق ہیں۔ان پر نگاہ غلط انداز بھی ڈال کر دیکھ لیجئے۔سارے اندازے غلط ہو جائیں گے ان سے بہتر اور کمتر آدمی ہوں گے مگر ان کے جیسا اور کوئی نہیں ان دونوں کے اندر ایک ایک شاعر بھی ہے۔ابھی انہوں نے نجانے کیا کیا چھپایا ہوا ہے جو مکمل کر چھپا رکھا ہے۔انہوں نے کسی کو نہیں مل سکتا۔بانو پراسرار لگتی ہیں اشفاق صاحب اسرار لگتے ہیں۔دونوں صوفی ہیں ملامتی صوفی۔دونوں کا عمل اپنا اپنا ہے ردعمل ایک سا عمل ظاہر ہوتا ہے۔ردعمل چھپایا جا سکتا ہے ایک بے نام سانجھ ان کے درمیان قائم ہے۔وہ ایک دوسرے کو مانتے ہیں جانتے نہیں جاننا ضروری بھی نہیں۔یہی ایمان بالغیب ہے بظاہر مختلف باطن مشترک ایک برتن ہے ان کے پاس جس میں سے بیک وقت اپنی پسند کی غذا نکال لیتے ہیں۔دونوں اپنے وقت کے مصلوب کردار ہیں بانو اشفاق کی صلیب پر لٹک گئی ہیں۔انہیں تو یہ صلیب دکھائی بھی نہیں دی۔''راجہ گدھ'' کو چھوڑ کر تقریباً تمام تخلیقات میں بانو کا انداز تیرے سامنے بیٹھ کے رونا تے دکھ تینوں نہیں دسنا'' والا ہے۔وہ روتی ہے اور سامنے بھی نہیں بیٹھتی۔ایسے میں اپنے آپ سے بھی دور

کہیں ہوتی ہے انہوں نے اپنی مشکلوں کا پتہ نہیں چلنے دیا اشفاق احمد کو۔ اپنے آپ کو محدود کر کے لامحدود ہونے کی کوشش کی ہے۔ مگر لگتا ہے کہ یہ حدود اس دائرے سے باہر نہیں جاتیں تو جو اشفاق احمد کے گرد بن گیا ہے۔ کمال یہ ہے کہ ایک گھریلو عورت عظیم ادیبہ بن گئی ہے۔ بانو کو بڑی عزت ملی ہے۔ انہوں نے سر کی چادر کو کاغذ بنایا اور چار دیواری میں شش جہات تلاش کر لیا ہے۔ وہ سامنے سے سب مسو ہیں مگر اپنے اندر بہت ایکٹو ہیں۔ ان کی خواہش ہے کہ ظہور اور اخفا میں فرق مٹ جائے۔ اشفاق احمد نے نئے علوم کو اپنے اندر گم کر لیا ہے اس گمشدگی کو پینڈو اور ان پڑھ بابوں کی کٹیاؤں میں ڈھونڈھ نکالتے ہیں دانش جب تکمیل اور تازگی کی طرف سفر کرتی ہے تو لوک دانش میں جمع ہو جاتی ہے۔ ایک دفعہ میں ان سے کہا کہ لاعلمی کی بھی اپنی ایک تہذیب ہوتی ہے تو انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ تمہیں یہ بات کہاں سے معلوم ہوئی۔

میں نے کہا معلوم نہیں۔''

وہ اور خوش ہوئے۔

اصل بات معلوم سے نامعلوم نامعلوم سے معلوم کی طرف سفر کے دوران ملتی ہے ہوی ہو کے رہتی ہے اور یہ ان ہونی میں موجود ہوتی ہے۔ اشفاق احمد لوگوں کو حیران کرنے کے عادی ہو گئے ہیں کچھ لوگ ان کے اس ہنر سے خاصے پریشان ہیں۔''

ایک بات میں اشفاق احمد کو بانو پر برتری حاصل ہے۔ بانو ان کی ہر طرح کی برتری کو دل سے مانتی ہیں۔ اشفاق احمد کو اس صورت حال نے خاصا سازگار کیا۔ اشفاق احمد گفتگو کے بادشاہ ہیں۔ موقعے کے مطابق جیسی بات چیت کا ملکہ کم کم کسی کو ملا ہوگا۔ اس ضمن میں بھی ان کی ''ملکہ'' کو نظر انداز کرنا مشکل ہے بانو ان کے سامنے بولتی ہی نہیں۔ بولتی ہیں تو ایسے جیسے تھکے ہارے گھر آئے ہوئے کے لیے دروازہ کھولتی ہیں۔ پھر ان کی خدمت کی فراوانیاں سارے ماحول میں ایک خوشبو گھولتی ہیں۔ اشفاق احمد تازہ دم ہو جاتے ہیں۔ اپنے زمانے میں کھڑے اشفاق احمد جو باتیں کر رہے ہیں کوئی نہیں کر رہا کر نہیں سکتا یا کرنا چاہتا نہیں۔ وہ ان چیزوں کے خلاف باتیں کرتے ہیں اور اس وقت کرتے ہیں جب ان کی حمایت کا موسم ہوتا ہے۔ سائنسی ترقی کے خلاف ترقی کے خلاف علم کے خلاف کتاب کے خلاف سب سے پہلے یہاں انہوں نے کیسٹ کے ذریعے مطالعے کی بت چھیڑی اس وقت سب سے زیادہ ان کی مخالفت انتظار حسین نے کی جب اس طرح کی پہلی کیسٹ ادارہ ثقافت اسلامیہ کے زیر اہتمام سیرت النبی کے حوالے سے تیار کی گئی۔ کتاب مارٹن لنگز اور اس کا اردو ترجمہ انتظار حسین نے کہا۔

یہ اتفاق ہے ایسے اتفاقات اشفاق احمد کی زندگی میں بہت ہیں۔ ان کی فراست کی فطرت نے کئی بار حمایت کی اور بانو جی نے

ہمیشہ اشفاق احمد سے اتفاق ہی کیا ہے۔اس لیے گھر سے باہر اشفاق احمد بہت اختلافی گفتگو سن کر بھی طیش میں نہیں آتے۔جب راولپنڈی میں ایک تقریب کے دوران نوجوانوں نے اپنے جملوں کو حملوں کے برابر کر دیا تو اشفاق احمد نے سٹیج پر آ کر سیدھے سیدھے اعتراف سے بات شروع کی اور وہ ساری باتیں جو نوجوانوں کے اعتراضات سے بھری ہوئی تھیں خود انہیں کے کندھوں پر رکھ دیں اور وہ خوشی سے نعرے لگاتے ہوئے یہ گٹھڑیاں اٹھا کر اپنے گھروں کو چلے گئے۔ایسے واقعے اشفاق احمد کی زندگی میں کافی ہیں۔ریڈیو پاکستان پر جب وہ تلقین شاہ کا پیکر پہن کر بات کرتے ہیں تو بھی ہمیں برے نہیں لگتے۔یہی باتیں کوئی اور کرے تو ہم اس سے لڑ پڑیں ہر شخص کے اندر ایک تلقین شاہ ہوتا ہے ہم اسے چھپاتے رہتے ہیں۔سامنے آنے پر منافق کے دشمن بن جانے کا امکان زیادہ ہوتا ہے۔

اشفاق احمد نے بندے کے اندر سے نکال کر اس بندے کو سامنے لا کھڑا کیا ہے۔

ہمزاد بھی ہوتا ہے ہر شخص کا تسخیر نہیں ہوتا کسی سے اشفاق احمد نے اپنا ہمزادہ تسخیر کر لیا ہے ہم تو اپنے ہمراز کو بھی قابو نہیں رکھ سکتے۔بلیک میل ہوتے رہتے ہیں اس سے اشفاق احمد کی مدد سے ہم بلیک ہونے سے تو بچ سکتے ہیں۔''

یہ نہیں کہ اشفاق احمد کو غصہ نہیں آتا۔اگر کسی آدمی کے ہر عمل کا جواب محبت بھرے ردعمل سے رنگا جائے تو حیرت انگیز حد تک سوئی سرشت لہو میں جاگ اٹھتی ہے۔ورنہ اشفاق احمد بھی خان ہیں۔پٹھانوں کا رویہ گھروں میں بھی حاکمانہ ہوتا ہے اور بلا شرکت غیرے ہوتا ہے حاکم کو حلیم کرنے والی بڑی ہستی عورت ہے۔مقابلہ تو حاکم کو ظالم بناتا ہے۔مغرب میں یہی کچھ ہو رہا ہے وہاں عورت مرد کے برابر آ کر بھی مظلوم بنی پھرتی ہے۔

یہ بحث میرا موضوع نہیں۔میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ عورتوں اور لڑکیوں کو بانو جی سے ملنا چاہیے۔شاید ان کے اندر ایک مکمل عورت کی روح سرایت کر جائے۔وہ اشفاق احمد کو بہت بڑا سمجھتی ہیں۔

اپنا مرشد کہتی ہیں۔

''بانو کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے ایک پٹھان مرد کو ایک بہت بڑا انسان بنانے پر اپنا آپ نچھاور کر دیا۔''

بڑا انسان تو اشفاق احمد کے اندر تھا۔دنیا میں بہت لوگ ہوتے ہیں جن کے اندر ہوتا ہے بڑا آدمی۔مگر اسے باہر کا رستہ مشکل سے ملتا ہے۔دروازہ ملتا ہے تو کھلتا نہیں۔

عورت دیواروں میں بھی درازہ کرنا جانتی ہے۔

میں بھی پٹھان ہوں

میرے نانا مظفر خان بڑے سخت گیر پٹھان تھے انہوں نے بھی ایک اعوان لڑکی سے محبت کی پھراسے اغوا کر کے لے آئے اور شادی کر لی محبوبہ یہ تو مغویہ ہوتی ہی ہے۔کسی کو اغوا کیا نہیں جاسکتا۔یہ ڈاکہ ہوتا ہے۔عورت اغوا ہوتی ہے اسی لمحے میں جب محبت کی کرن اس کا لباس بن جاتی ہے۔یہ مخلوق منکوحہ ہو جائے تو اس کی حقیقت بالکل اور ہو جاتی ہے بابا مظفر خان نے بظاہر کوئی حسن سلوک نہ کیا نانی اماں سے مگر کبھی نانی کے لبوں پر حرف شکایت نہ چمکا۔ان کی حیثیت اس وقت کھلی جب وہ مر گئیں نانا کی شخصیت کا جلال ایک ملال میں بھیگ گیا۔

ایک دن وہ دیوار کے سائے میں اداس کھڑے تھے میں نے ان سے حال احوال پوچھا تو انہوں نے کہا۔

''بیٹا میں یتیم ہو گیا ہوں۔''

زوجہ زوجہ محترمہ بلکہ زوجہ ماجدہ کے رتبے پر جا پہنچی۔

محمد حسن عسکری نے کہیں ایک تمثیل بیان کی ہے کہ مرد بھول بھلیوں میں رازوں کے سراغ میں داخل ہوتا ہے۔عورت ہاتھ میں اون کا ایک گولا لے کر ایک سرا اسے پکڑا دیتی ہے۔کہیں سے کہاں تک گھومنے بھٹکنے کے بعد بھی وہ گم نہیں ہوتا۔اسے پیچھے کا رستہ نہیں بھولتا۔اون کے دھاگے کے رہبری میں واپس آ جاتا ہے۔اپنی عورت کے پاس جو اون کا گولہ لیے اس کی منتظر ہوتی ہے۔کارہائے نمایاں مرد کے ہیں عورت بظاہر بے عملی کی تصویر ہے عورت کا یہ عمل بے کار نہ ہو تو مرد کی واپسی مشکوک ہو جاتی ہے۔اسے بھٹکنے نہ دینے کا رستہ ہے وہ اشفاق احمد بھیدوں کی خاطر زندگی کی ٹیڑھی میڑھی راہوں پر تھک ہار کر اپنا سفر کھو بیٹھتا مگر بانو ان کے لیے مراجعت کی نشانی ہر وقت فراہم رکھتی ہے۔وہ کہیں چلے جائیں انہیں خبر ہوتی ہے کہ آغاز میں بانو ہو گی۔اس امید نے انہیں انجام سے بچائے رکھا ہے۔

ایسی کئی تمثیلیں دھرتی کے دل میں دھڑک رہی ہیں۔عورت اور دھرتی ایک حقیقت کے دو روپ ہیں۔دھرتی اپنے سینے پر چلنے والوں کو صرف تحمل کا تحفہ ہی نہیں دیتی۔طاقت کا توازن بھی دیتی ہے۔

دھرتی کا سینہ تخلیق کا منبع ہے۔دھرتی کسی سے روٹھی نہیں کسی کو روٹھنے دیتی بھی نہیں۔ہم اس کی کوکھ سے نکلتے ہیں اور پھر اسی کوکھ میں کہیں اور نکل جاتے ہیں۔وہ اپنوں کو سفر پر جانے دیتی ہے اور مراجعت کی طلب ان کے دل میں زندہ رکھتی ہے۔

جوگی اتر پہاڑوں آیانی چرخے دی گھوک سن کے

مجھے لگتا ہے کہ چاند پر بھی بانو جی ہی بیٹھیں چرخہ کاتتی ہیں اور اشفاق احمد سورج کو تسخیر کرنے نکلے ہوئے ہیں۔ شاید سورج کو تسخیر کرنے کا مطلب اسے چاند بنانا ہو۔ بانو منتظر رہتی ہیں۔ دھاگے کا گولہ ہاتھ میں ہے اور چرخے کی گھوکر۔

◆◆◆

محکمہ پولیس کا علمی شعبہ

بچپن کے سریلے سانولے آسمانوں پر جو نام پورے چاند جیتی چمک کے ساتھ روشن ہیں۔ان میں قائداعظم علامہ اقبال' محمد علی جوہر' ظفر علی خان' چوہدری افضل حق زیادہ واضح ہیں۔ چوہدری صاحب سے تو اباجی کو عجب طرح کا عشق تھا ہماری آنکھوں نے جب منظروں اور خیالوں کا ملا کر دیکھنا شروع کیا تو اباجی کو تھانیدار کی وردی میں ملبوس پایا۔ان دنوں تھانیداروں کی بڑی ٹور تھی۔ہم جب گھر سے باہر نکلتے تو ہماری آؤ بھگت پیروں کے صاحبزادوں سے کم نہ ہوتی تھی۔میں سچے بزرگوں کے پاؤں کی مٹی چومنا اعزاز سمجھتا ہوں۔مگر اب زیادہ تر پیروں اور تھانیداروں میں کوئی خاص فرق نہیں رہا۔یہ اس دنیا کے مالک وہ اس کے دنیا کے وارث۔اور کسی تیسری دنیا کے ساتھ ان کو بری چڑ ہے ہم نے وردی والے ابا کے چہرے پر خوشی کا غار تک کبھی نہ دیکھا تھا۔نہ ادھار مانگے فخر کی بھولی بسری لہر۔نہ چھوٹے رعب داب کا کچا منظر نامہ کسی بھلے آدمی کا تھانیداری سے بھلا کیا کام۔اس وقت ہمارے لیے وہ ایک نہ سمجھ میں آنے والے کرب میں رنگے ہوئے ہوتے۔اور ہم ایک بے رنگ خوف اور سہم میں نہائے نہائے رہتے۔ان دنوں ہم سب بہن بھائی اباجی سے ڈرنے کی ایکٹنگ میں ماہر ہو چکے تھے۔البتہ گھر میں چٹی سفید قمیض تہمد اور پگڑی پہنے ابا چاند اور گلاب کے ہمشکل ہو جاتے پھر بھی ہمیں ان کے قریب ہونے کی خواہش کا اپنے اندر کبھی اندازہ نہ ہوا تھا۔پھر اچانک وہ ایک کتاب نکالتے۔ہم سب بہن بھائیوں کو اپنے پاس بٹھاتے ہماری سخت مزاج مگر بہت سوہنی امی کو بلا لیتے اگرچہ وہ ان پڑھ تھیں مگر جب کسی درد بھرے بیان پر وسک ڈسک کر رو دیتیں تو ہمیں بہت پڑھی لکھی لگتیں۔اقبال کی نظمیں حفیظ کا شاہنامہ اسلام ظفر علی خان' کی نعتیں اور چوہدری افضل حق کی تحریریں یعنی نثر یلی باتیں۔

یہ چوہدری صاحب کی تحریر کا جمال تھا اور اباجی کی میٹھی ادائیگی کا کمال کہ ہمیں اس میں بھی شاعری کا سا مزا آتا۔''محبوب خدا'' ''زندگی'' اور ''جواہرات'' میں سے بہت کچھ انہیں زبانی یاد تھا۔ہمیں تو ان کے والہانہ انداز میں پڑھنے کی ادا نہیں بھولتی۔کوئی اچھا ٹکڑا نثر کا آتو تو اسے دوبارہ پڑھتے اور کتاب بند کر کے دونوں ہاتھوں سے اسے ایک عجب جوشیلی دھن میں بجاتے۔انگلی اٹھا کر اللہ اللہ کرتے۔آج بھی ان کی آواز مجھے تڑپاتی ہے۔وہ جواہرات پڑھ رہے ہیں۔یہ فقرے تو مجھے بھی یاد ہو گئے تھے'' کون ایسا دھرماتما ہے' کون اتنا ایمان دار ہے جو گناہ کے قریب ہو کر بچ نکلے جوانی کے دن تنہائی کا موقع تو پھر جو خوف خدا کو دل میں لا کر گناہ سے نفور ہو

جائے اسے کہہ دو کہ تیری سات پشتوں پر دوزخ کی آگ حرام دنیا و مافیہا پر تیرا تسلط تیرا قدم فرشتوں کے کاندھوں پر غلمان تیری غلامی کو فخر اور حوریں تیری خدمت کو عزت سمجھیں گی۔ خدا تیری آنکھ سے دیکھے گا۔ تیری زبان سے بولے گا۔ تیرے کان سے سنے گا۔ انسانوں میں تیرا نام عزت سے لیا جائے گا۔ قومی کہانیوں میں تیری مثال دی جائے گی۔ تو مر جائے گا تیرا نام زندہ رہے گا۔''

میں یہ سوچتا ہوں کہ کیا یہ باتیں افضل حق نے اپنے بارے میں کہی تھی۔ میرے ابا مرحوم کے بارے میں کہی تھی اور اس کے بعد میں سوچنا بھول جاتا ہوں۔ ہم نجانے کیا کچھ بھولتے جا رہے ہیں۔

ابا جی محبوب کد اپڑھ رہے ہوتے تو رسول کریم کی کسی ذرا سی تکلیف کو بیان پڑھ کر اس بے ساختگی سے روتے اور بے ساختگی اور بے چارگی میں فرق مٹ جاتا وہ اگر روتے تو نجانے کیا کچھ کر گزرتے مگر وہ اور ہم آخر اس کے علاوہ اور کر بھی کیا سکتے ہیں۔ تب کرچی ابا ہمیں بہت ملائم اور بہت پیارے لگتے۔ کسی شخصیت کی کسی فن پارے کی ایسی تحسین ایسی تعریف کا منظر آج تک پھر کبھی میں نے نہیں دیکھا۔

دوسرے بزرگوں کے علاوہ چوہدری صاحب کے لیے بھی دل میں ننھی منھی چاہتوں کا ایک ہجوم نعرے لگانے لگ جاتا۔ ہم سب بہن بھائی ابا جی کو انگلی اٹھائے خوش دیکھتے تو ایک حیران سی خوشی ہمارے دل میں شرما شرما جاتی۔ البتہ جب وہ رونے لگتے تو ہم بھی اس کار خیر میں ان کے ساتھ شریک ہو جاتے۔ آنسوؤں کی ایک چادر سچے رشتے کا خیمہ غم تان دیتی۔ اکڑی ہوئی وردی میں بھنچے ہوئے چہرے والا ابا صرف اسی لمحے ہماری دسترس ان کی چارپائی کے سرہانے موجود رہتیں۔ ہمیں یقین تھا کہ افضل حق ان کے کوئی بہت گہرے دوست ہیں۔ ہمارے گھر مہمان تو بہت آتے مگر ہم صرف اپنے ماموں ڈاکٹر غلام اکبر خان نیازی کے آنے پر خوش ہوتے۔ یا منتظر رہتے کہ کبھی چچا افضل حق آئیں گے۔ وہ کبھی نہ آئے۔ اور اس وقت ہم میں ابا جی سے یہ پوچھنے کی جرات ہی کب تھی کہ چنگے دوست ہیں آپ کے آتے ہیں نہیں کبھی۔ جب ہمیں پتہ چلا کہ وہ بھی تھانیدار ہیں تو ہم بہت مایوس ہوئے مگر جب یہ معلوم ہوا کہ انہوں نے استعفیٰ دے دیا ہے تو ایک نامعلوم سا اطمینان ہوا۔ اس وقت استعفیٰ کا یہ مطلب ہماری سمجھ میں آیا تھا کہ چوہدری صاحب نے وردی اتار کر سفید قمیص تہمد پگڑی باندھ لی ہوگی اور اپنے بچوں کو کتابیں پڑھ پڑھ کر سناتے ہوں گے سارے جہان کے ابا جی ایسے ہو جائیں تو کس رنگ کا انقلاب آ جائے نجانے ہم نے اس خواہش کی مٹھاس اپنے لہو میں چکھی۔ پھر تو ابا جی کو ایسا ہی کرنا چاہیے فوراً۔ اور وہ ایسا نہ کر سکے۔ وہ تو بس کبھی کبھی تھوڑی دیر کے لیے استعفیٰ دیتے تھے ہم کچھ کچھ بڑے بھی ہو گئے مگر ابا کے دوست نہ بن سکے ان کی محبت کا نور اپنے بدن اور باطن کے آخری تاریک تر گوشے میں بھی دیکھ لیتے مگر وہ خود بے نور ہوتے جا رہے تھے۔ ایک مرتبہ جب

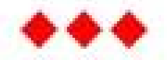
ایک بھائی نے بے دھیانے میں کہہ دیا کہ میں بڑا ہو کر تھانیدار بنوں گا تو ابا بہت دکھی ہوئے۔ ورنہ پہلے کوئی ناگوار بات سن کر خفا ہوتے تھے اور بے تحاشا پیٹتے۔ تب پہلی بار محسوس ہوا کہ ارمان اور غصے میں کتنا فرق ہے نامہربان ساعتوں کی جابر صورت حال نے ابا جی کے وجود سے سچے جذبوں کے اظہار کی ادا بھی چھین لی تھی۔ پریشانی کی بات یہ تھی کہ انہوں نے کبھی کسی پر کوئی ظلم نہ کیا تھا۔ کبھی رشوت نہ لی۔ پھر ان کے دردمند احساس کو گھن کیوں لگ گئی تھی۔ وہ کیا ستم ہے جس نے چوہدری افضل حق کو استعفیٰ پر مجبور کیا اور ابا جی کو استعفیٰ کی خواہش میں محسور کیا وہ کہتے تھے اس نظام میں ایک سچ کو ثابت کرنے کے لیے سینکڑوں جھوٹ بولنے پڑتے ہیں۔ جو انصاف جھوٹ کی گھنٹیاں بجا بجا کر ملے وہ کیا انصاف ہوگا۔ ہمارے ہاں جھوٹ کی حفاظت کے لیے بچوں کی ڈیوٹی لگا کر اسے ملازمت کا نام دے دیا گیا ہے۔ چوہدری افضل حق کے جیل جانے کا واقعہ ہوا ابا جی اتنے رنجیدہ اور سنجیدہ تھے کہ ہم نے سوچا کہ جیسے یہ کاروائی بھی انہیں ہی کرنا پڑی ہو۔

لگتا ہے جیسے انہوں نے کئی افضل حق گرفتار کیے ہوں۔ وہ بھی جو مشہور نہ ہو سکے۔ وہ نوکری چھوڑ تو دیتے مگر انہیں گھر کا دروازہ نظر آتا تھا جہاں سے باہر آنے کی اجازت ہے۔ مگر پھر اندر جانے کی نہیں۔ وہ اور ہم سب جس جکڑی ہوئی صورت حال میں وہاں اپنے کیے پر نظر ثانی کرنے کی گنجائش نہیں البتہ اپنے آپ کو مسلسل نظر انداز کرنے کی کھلی چھٹی ہے۔ ہم نے اپنی بے بس آنکھوں سے چوہدری افضل حق کی دوست اور ہمراز زندگی کو درندگی اور شرمندگی کے درمیان بسر ہوتے دیکھا بلکہ ان اجڑی لٹی ہوئی عمروں کو بھی کوئی اور بسر کرتا رہتا ہے۔ آخر چوہدری صاحب نے آزادی کے وصال کے لیے جو معرکہ کیا جو قربانی دی بعد میں اس کے معنی کیوں بدل گئے ان کا اجر صرف غیر متعلق چند لوگوں کو ہی کیوں ملا۔ جب ابا خان گڑھ میں تعینات تھے تو ایک مرد احرار نوابزادہ نصر اللہ خان نے انہیں ملاقات کے بعد کہا کہ آپ جیسے لوگ بھولے سے اس محکمے میں آجاتے ہیں۔ کتنے لوگ اس بھول کی دھول میں اٹ گئے۔ آخر یہ بھول کیا ہے۔ ”میرا افسانہ“ لکھنے والا افضل حق یہ افسانے کب لکھے گا۔ ابا جی ساری عمر حق وانصاف کے لیے جھوٹی ضمنیاں لکھتے رہے۔ ان میں ادبی رنگ ہوتا انہیں ایک خاص طرح سے مرتب کریں تو ہماری زندگیوں کے کئی گمشدہ عکس اس میں ہوں۔ سنا ہے ان کی ضمنیاں محکمہ پولیس میں نمونے کے طور پر یاد کی جاتی تھیں۔ لیکن ابا جی ساری عمر اپنی ضمنی نہ لکھ سکے۔ تین مرتبہ ہارٹ اٹیک کے بعد جبری ریٹائرمنٹ پر وہ گھر آئے۔ ہم نے پہلی بار محسوس کیا کہ وہ واقعی گھر آئے ہیں۔ ہم نے یوں محسوس کیا کہ ان سے زیادہ دردمند آدمی دنیا میں ہے کوئی نہیں۔ ہمارے عہد میں نوکریاں ایسی کیوں ہوتی ہیں کہ آدمی استعفیٰ نہ دے سکے تو زندگی سے ہی ریٹائر ہو جائے۔ اب ابا کی زبان سے ”محبوب خدا“ ”جراہرات“ ”زندگی اور“ ”میرا افسانہ“ سن کر روشنیوں کا رنگ ہی اور ہو گیا مگر یہ روشنی ان

کے اندر دور تک اترے ہوئے اندھیرے سے پوری طرح ہمکلام نہ ہو سکی۔ اور وہ مر گئے۔ مگر وہ کتابیں اب بھی ان کے کمرے میں ان کے سرہانے پڑی ہیں۔ یاد اور تنہائی اباجی کی جو شبیہ بناتی ہے اس میں وہ صرف افضل حق کی کتابیں سناتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ہم نے تو ابا کو دریافت ہی اس معرفت سے کیا تھا۔ آج جب میں چوہدری افضل حق کی کتابیں پڑھتا ہوں پھر ان کتابوں کو بھی پڑھنے کی کوشش کرتا ہوں جو ابا نہیں لکھ سکتے تھے یہی وہ کتابیں ہیں جو آنسوؤں سے دھل کر لہو میں سنور کر بکھرتی ہوئی مٹی پر رقم ہوتی ہیں تو انہیں سارا جہان پڑھتا ہے وہ بھی جو پڑھتا نہیں جانتے۔ پھر لوگ خود استعفیٰ پر مجبور نہیں ہوتے کسی اور کو استعفیٰ دینے پر مجبور کر دیتے ہیں۔

رہی چوہدری افضل حق کے ادبی مقام و مرتبہ متعین کرنے کی بات تو ادب کے نام پر تہذیبی اور نظریاتی بے ادبی عام کرنے والوں کو اتنی فرصت اور توفیق کہاں اور جہاں تک میرے جیسے ملازم پیشہ ادیبوں کا تعلق ہے تو ہمیں استعفیٰ دینے کی جرات اور سلیقہ کہاں۔ آج کل تو ادیبوں میں سے بھی بہت سی عورتوں اور مردوں نے تھانیداروں جیسا کام بڑے دھڑلے سے شروع کر رکھا ہے۔ افضل حق نے بہت خوبصورت پر تاثیر اور قدرے جوشیلی نثر لکھی ہے۔ ان کے ہاں داستانوی اسلوب کا جمال اپنے جوبن پر رہتا ہے۔ ''میرا افسانہ'' زندگی'' اور جواہرات میں چھوٹی چھوٹی حکائتیں۔ حقیقتیں بنتی دکھائی دیتی ہیں۔ ''اسلام آزادی ہند اور ''معشوقہ پنجاب'' میں جیسے کہانیاں ہی کہانیاں ہیں۔ افضل حق ایک نشیلی دلچسپی میں قاری کو جکڑے رہتے ہیں جو جادو عطاء اللہ شاہ کی تقریر میں تھا تقریباً وہی اثر افضل حق کی تحریر میں تھا۔ افضل حق نے پولیس کی ملازمت سے استعفیٰ بھی شاہ جی کی ایک تقریر کے دوران اپنے کسی جونیئر افسر کے حوالے کر دیا تھا پھر وہ وردی کے ساتھ دفتر نہ گئے۔ مسلم انقلابی فکر کو جدید انداز کی فراوانیوں میں لوگوں کے ذہن و دل میں راسخ کرنے کی منفرد صلاحیت انہیں فطرت نے وافر مقدار میں عطا کی تھی۔ انہیں مفکر احرار کا خطاب یونہی تو نہیں مل گیا تھا۔ برصغیر کی تاریخ میں احراریوں کے مکمل کردار کے پس منظر میں افضل احق کی فکر اور فکر مندی دونوں پوری طرح کارفرما ہیں۔ وہ عملی اور عملی دونوں میدانوں میں ایک بہادر راجپوت کی شان و شوکت کے ساتھ پہلی صف میں دکھائی دیتے ہیں۔ وہ ان لوگوں میں سے تھے جنہوں نے پلی بار سوشلزم کی اصطلاح کیا وہ ہر طرح کے استحصال کے خلاف تھے ان کا طرز فکر مولانا حسرت موہانی سے مختلف تھا۔ مگر وہ حضرت ابو ذر غفاری کے سچے پیروکار نظر آتے ہیں۔ انہیں سوشلسٹ بھی کہا گیا۔ مگر جب کوئی الزام فیشن اور رسم کے دائرے میں چکرانے لگتے تو اس کی معونیت بدل جاتی ہے اور اس کی اہمیت بھی بڑھ جاتی ہے۔ ایک کھرا انقلابی تھا افضل حق اور ایک سچا مسلمان۔ یہ دونوں طرح کی شخصیتیں ہمارے تہذیبی منظر سے ناپید ہوتی جا رہی ہیں۔ اب انقلابیوں اور اسلامیوں کے نعرے بھی ایک جیسے ہیں نالے بھی ایک

جیسے۔کوئی افضل حق کی آنکھوں سے دیکھے تو انقلاب اور اسلام میں فرق ہی کیا ہے۔ ’’محبوب خدا‘‘ اصل میں محبوب خلائق ہیں ان سے بڑی انقلابی شخصیت تاریخ انسانی میں اور کون ہے۔



تحقیق کی پرانی روایت

بوڑھا آدمی لمبی عمر کے ایک درخت کی طرح ہوتا ہے۔اس نے کئی زمانوں کو اپنی چھاوں میں گزرتے دیکھا ہوتا ہے اس کے پاس چند لمحے بیٹھنے سے وہ کچھ مل جاتا ہے جو برسوں کی محنت سے نہیں مل پاتا میں نے بچپن میں اپنے دادا جہان خان ذیلدار موسیٰ خیل ضلع میانوالی اور نانا مظفر خان سے جو کچھ سنا وہ کہیں لکھا ہوا نہیں دیکھا جوان بزرگوں کی آنکھوں میں آباد تھیں کئی حکمتیں تھیں جوان کی باتوں میں چھلکتی رہتی تھیں۔ مجھے بوڑھوں اور بابوں سے ملنے کا شوق ہے۔اس شوق کی رفاقت میں مجھے اپنے بزرگوں میں سے کئی لوگ یاد آتے ہیں بوڑھے آدمی کو بھی بابا ہی کہا جاتا ہے جو آدمی کچی طرح اپنے بوڑھے ہونے کے احساس کو اعزاز سمجھتا ہو بابا ہی ہوتا ہے علاقے میں جب کسی کی داڑھی سفید ہو جائے تو وہ بڑا آدمی تصور کیا جاتا ہے۔ پھر سب پر اس کی عزت فرض ہو جاتی ہے۔ کچھ لوگ ہیں جنھوں نے بوڑھا ہونے سے انکار کر رکھا ہے۔اپنی مکمل مصروفیت اور متوازن رویے سے وہ صرف جوان نظر ہی نظر آتے ہیں۔

عجیب بات یہ ہے یا مجھے عجیب محسوس ہوتی ہے کہ جو آدمی داڑھی نہ رکھتا ہو وہ بوڑھا ہونے سے انکار کر رہا ہوتا ہے۔ داڑھی بڑھاپے کا وقار بڑھا بھی دیتی ہے ظاہری وجاہت میں بھی اضافہ ہو جایا کرتا ہے۔ بعض داڑھی منڈے بڈھے برے لگتے ہیں لیکن داڑھی کی سفیدی ایک خوف بھی لہو میں پھیلا دیتی ہے۔ بہر حال یہ مسئلہ کوئی اتنا اہم نہیں۔ کئی لوگوں کو داڑھی رکھنے اور بلی رکھنے میں فرق محسوس نہیں ہوتا۔ بوڑھا آدمی جوان نظر آئے مگر دل اس کی عزت کرنے پر مائل ہو۔ یعنی بوڑھا نظر نہ آئے مگر بڑا بڑا لگے تو ہماری ملی تاریخ میں قائداعظم ایسے انسان ہیں جنھوں نے کسی لمحے اپنے بوڑھے ہونے کا پتہ نہ چلنے دیا۔ حیرت ہوتی ہے کہ کوئی بوڑھا اتنا دلیر اتنا پر شکوہ بھی ہو سکتا ہے بڑا بڑا جواں ہمت بوڑھا نظر آتا ہے ہمیں اپنی ادبی تاریخ میں بھی۔ آخری وقت تک ان کی شان میں کمی نہیں آئی۔ ان کی خوش طبعی خوش خلقی چاروں طرف خوشبو کی طرح بکھری چاروں طرف بکھرتی زندگی میں کوئی نہ کوئی اچھے رنگ کی آس آخری دم تک قائم رہی ہماری دعا ہے کہ اللہ قریشی صاحب کی عمر دراز کرے۔ ان کا بڑھاپا ایک دوست ہمسائے کی طرح پسندیدہ ہو رہا ہے۔

جس طرح انہوں نے اپنے محبوب دوستوں پروفیسر علم الدین سالک اور منشی محمد الدین فوق کو یاد رکھا لگتا ہے قریشی صاحب انہیں بھی اپنے ساتھ جیتا رکھنا چاہتے ہیں۔ میں نے ان دونوں بزرگوں کے لیے محبوب کا لفظ استعمال کیا ہے کہ قریشی صاحب ان سے جتنی محبت رکھتے ہیں اتنی ہی محبت یہ دونوں کشمیر سے رکھتے تھے قریشی صاحب ایسی محبتوں کو یکجا کر چکے ہیں۔ ایسی سعادت کی مثالیں

ہمارے زمانے میں کم کم ملتی ہیں جیسے قریشی صاحب کو زندگی میں اور کوئی کام ہی نہیں۔ انہوں نے فوق صاحب کے کاموں میں کارناموں کی کامیاب تلاش کے علاوہ بھی بہت معرکے سر کے ہیں۔ میں نے ان کی درازی عمر کی دعا کی ہے۔ مگر ان کی خدمت میں دعا کی درخواست کے لیے کہنے کو دل نہیں کرتا کہ ان کے اور اپنے درمیان آدھی صدی کے منور فاصلے کے باوجود اہیں زیادہ مستعد پاتا ہوں۔ ان کے اندر آج بھی مسلسل کام کرنے کی جو لگن ہے۔ اس سے ملتی جلتی تڑپ میرے لہو میں بھی کبھی کبھی جاگتی رہتی ہے۔ مگر مگن ہونے کی ان جیسی صلاحیت ہم میں کہاں۔ ان کا ہونا ایک برکت کی طرح ہے۔

قریشی صاحب کی رفاقتیں پروفیسر علم الدین سالک سے بھی بہت لمبے اور گہرے وقت میں پھیلی ہوئی ہیں۔ سالک صاحب کے بچے آج بھی قریشی صاحب کو اپنا حقیقی چچا سمجھتے ہیں۔ یہی ان کے والد کی وصیت تھی فوق صاحب نے بھی اپنے بچوں کے علاوہ قریشی صاحب کو اپنا فرزند قرار دیا تھا۔ ان کی جائیداد میں سے قریشی صاحبنے صرف غیر مطبوعہ کتابیں چن لیں۔ اس طرح کی دوستیاں تاریخ کے صفحات میں صرف مثال کے طور پر ملتی ہیں۔ سالک صاحب بہت بڑے عالم تھے۔ نامور استاد تھے ایک اچھے آرٹسٹ تھے مگر وہ لکھنے سے کتراتے تھے۔ قریشی صاحب نے ان سے مختلف موضوعات پر طویل گفتگوئیں کیں۔ اور پھر ان کے خیالات کو قلمبند کر لیا۔ اس طرح علم و ادب کے طالب علموں کو بے شمار تاریخی اہمیت کے مضامین پڑھنے کو ملے قریشی صاحب سفر و حضر میں سالک صاحب کے ساتھ رہے۔ کشمیر میں فوق صاحب بھی ان میں شریک ہو جاتے۔ علم و ادب کی یہ تکون اب ایک دائرے میں تبدیل ہوتی جا رہی ہے۔ اسی دائرے میں رہتے ہوئے قریشی صاحب قابل رشک صحت کے مالک ہیں۔

عمر جب کاٹ چکوں گا تو شباب آئے گا

قریشی صاحب کی جوانی بھی ایک حیران کر دینے والی کہانی ہے انہوں نے ایک بھرپور زندگی بسر کی ہے ورنہ زندگیاں بالعموم لوگوں سے بیزار ہوتی ہیں اور چپکے سے ناواقف مسافروں کی طرح گزر جاتی ہیں۔ قریشی صاحب نے اپنی طویل عمر کا ایک ایک لمحہ پوری تفصیل سے گزارا ہے۔ ان کی زندگی ایک باقاعدگی کی مثال ہے اگرچہ بے قاعدگی میں بھی اپنا ایک لطیف ہے۔ زیادہ لوگ بڑی باقاعدگی سے بے قاعدگی کرتے ہیں تو یہ بھی ایک قسم کی باقاعدگی ہوئی۔ قریشی صاحب نے بڑے خلوص سے اپنی زندگی کو ایک علمی سر گرمی بنا دیا ہے۔

فوق صاحب نے کشمیر کی شاداب اور خوبصورت تہذیب کو تاریخ بنایا پھر اس تاریخ کو تحریک بنا دیا۔ اس کارنامے میں انہیں قریشی صاحب کی رفاقت برابر حاصل رہی کشمیر کا ظاہرہ حسن تو سب دیکھ لیتے ہیں۔ ان دونوں بڑوں نے کشمیر کے تمدنی حسن کا بھی سراغ لگایا ہے۔ لوگ تو جا کر کشمیر میں رہتے ہیں مگر کشمیر فوق صاحب کی آنکھوں میں بس گیا۔ اب فوق صاحب کا کشمیر قریشی صاحب کے دل میں زندہ ہو گیا ہے۔ ان کے لفظ دھڑکتے ہیں تو پڑھنے والے کا دل بھی بھڑکتا ہے۔ قریشی صاحب کی رفیق تحریروں کی

معرفت گزرا ہوا زمانہ ایک بار پھر گزرنے لگتا ہے۔فوق صاحب کی دو ہستیاں جو ظفر علی خان اور علامہ اقبال تک پھیلی ہوئی ہیں قریشی صاحب نے انہیں ہماری دوستیاں بنانے کی کوشش کی ہے۔

ایک دوستی علامہ اقبال سے قریشی صاحب نے بھی استوار کی کہ جو دوستی کسی کے ساتھ ان کی موت کے بعد دل و ذہن میں پیدا ہوتی ہے۔وہ بہت پائیدار بہت شاندار اور بہت زوردار ہوتی ہے یہ کسی ذات کو اپنی کائنات میں نافذ کرنے والی بات موتی ہے۔اس دھن میں قریشی صاحب نے ''حیات اقبال کی گمشدہ کڑیاں دریافت کیں۔

اور اقبال کو وہاں جاتا اس کیا جہاں جہاں لوگوں نے انہیں گم کر دیا تھا۔دانشوروں نے اقبال کی فکر و دانش کو اپنے آپ میں ڈھونڈھنا چاہا۔قریشی صاحب نے اقبال کی دردمندیوں کو ایک بار پھر اپنی محبت و محنت کے میدان میں پانے کی جدوجہد جاری رکھی۔ اس کے بعد یہ کیفیت اقبال کے چاہنے والوں میں بھی اپنی بے لوث تحریروں کے ذریعے تقسیم کی۔

اقبالیات کے حوالے سے قریشی صاحب کو ایک اور انداز میں یاد رکھا جائے گا۔

جب جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال علامہ اقبال کے ساتھ خون کے رشتے کی روشنی لے کر کچھ اور رابطے بنانے کے سفر پر نکلے تو اس رستے پر پاپیادہ چلنے والوں میں ایک چپ چاپ مسافر عبداللہ قریشی صاحب سے بھی ان کی ملاقات ہوئی۔اور انہوں نے کئی ملاقاتیں اپنے اندر جاگتے ہوئے محسوس کیں قریشی صاحب نے کبھی ماہر اقبال کہلانے کی خواہش نہیں کی۔البتہ ان کے محبت اقبال ہونے کو دوسروں کے علاوہ فرزند اقبال نے بھی مان لیا بلکہ پہچان لیا۔کیونکہ پہچاننا ماننے سے بڑا اور سچا عمل ہے ورنہ ہمارے لوگوں کے پاس آسان طریقہ ہے کہ کسی کو مان لیتے ہیں یا نہیں مانتے اور اس کے بعد بیٹھ جاتے ہیں۔

قریشی صاحب بڑے دھیمے مزاج کے آدمی ہیں۔ایک آہستہ انداز زندگی کی طرح بہے چلے جارہے ہیں۔سینکڑوں نے یہاں سے پیاس بجھائی وہ درویشی میں محی الدین فوق اور علم الدین سالک کے میدان کے آدمی ہیں۔وہ اپنے محبوب و محترم بزرگ دوستوں کے کمالات کے وارث ہیں۔

قریشی صاحب نے کچھ نقاروں کے اس خیال کو حرف غلط کر دیا ہے کہ فوق صاحب شاعر اور ادیب کی حیثیت میں کوئی خاص مقام نہیں رکھتے۔مورخ کشمیر کے طور پر اور کشمیر شناسی کے معاملے میں فوق کی مسلم حیثیت پر تو کوئی گرفت کر ہی نہیں سکتا۔ادیب و شاعر کے طور پر فوق صاحب کے نظروں سے اوجھل مرتبے کو قریشی صاحب نے دریافت کیا۔

اب زمانہ مشیر اور فوق صاحب کی کیفیوں اور حیثیتوں کو قریشی صاحب کے سچے جذبوں کی روشنی میں اور قریب سے دیکھ رہا ہے۔

اس انداز میں دیکھ رہا ہے جس طرح قریشی صاحب دیکھ رہے ہیں۔اس بے مثال عمل میں پہلی نظر قریشی صاحب پر پڑتی ہے میں نے محمد الدین فوق کے علمی وادبی کام پر پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھا تو اس کی ترغیب مجھے ڈاکٹر وحید قریشی نے لائی اور مدد کی کہ عبداللہ قریشی نے اس ضمن میں ڈاکٹر سہیل احمد خان کی دوستانہ رہنمائی بھی ہمیشہ یاد رہے گی۔قریشی صاحب نے وہ سب کچھ جو فوق صاحب کے حوالے سے ان کے پاس تھا میرے حوالے کر دیا یہ ایک دوہرے جذبے والی مہربانی ہے۔

اس طرح میں نے پی ایچ ڈی کر لی۔اور فوق صاحب کے حوالے سے تحقیق وتنقید کے مروجہ معیاروں کے مطابق کام کی تکمیل ہو گئی۔یہی قریشی صاحب کی عمر بھر کی خواہش اور کوشش تھی۔

قریشی ص آحب نے برصغیر کے تقریباً تمام علی وادبی رسائل نیرنگ خیال عالمگیر قوس وقزح' فردوس' حقیقت' اسلام' ادب لطیف' تہذیب نسواں مخزن' ادبی دنیا' نسوانی دنیا' نقوش فنون مجلہ اقبال خیام شاہکار المعارف' اقبال ریویو اور کئی دوسرے رسائل میں بے شمار مضامین لکھے۔نقوش کے کئی خاص نمبروں میں ترتیب وتسوید میں جناب محمد طفیل کا ہاتھ بٹایا۔مولانا صلاح الدین احمد کے انتقال کے بعد ادبی دنیا کی ادارت سنبھالی۔کچھ عرصہ ''المعارف کی ادارت بھی کی اس کے علاوہ قریشی صاحب نے ساغر صدیقی مرحوم کے کلام کو ضائع ہونے سے بچا لیا۔ساغر صاحب تو نشے میں مگن رہتے تھے۔قریشی صاحب ان سے بہ اصرار کلام حاصل کرتے رہے اور اس طرح ان کے پانچ مجموعے مرتب ہو کر طبع ہوئے۔

میں یہ سب باتیں اس لیے لکھ رہا ہوں کہ قریشی صاحب کی علمی وادبی خدمات کا ملک گیر اعتراف نہایت ضروری ہے کہ خود انہیں شہرت وخودنمائی سے کوئی دلچسپی نہیں عمر بھر وہ تحقیقی سرگرمیوں کی گوشہ نشینی میں مست رہے۔وہ ہماری علمی وتحقیقی تاریخ کے ایک عظیم خاموش کارکن ہیں۔ان کی خدمات کی تحسین وتعریف مولانا غلام رسول مہر نے بھی کی ہے۔مختلف موضوعات پر ان کی پندرہ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔اتنی ہی زیر طبع ہیں اور تقریباً اتنی ہی کتابوں کا مواد ان کے پاس مرتب کیا ہوا رکھا ہے۔

قریشی صاحب بیسوی صدی کے پیچھے پیچھے چل رہے ہیں وہ اس سے پانچ برس چھوٹے ہیں اردو تحقیق میں قریشی صاحب اس صدی کے چند بڑے رفیقوں میں سے ایک ہیں مجھے امید ہے کہ وہ عمر میں اس صدی سے کئی پانچ برس بڑے ہو جائیں گے ہم 2005 میں ان کا صد سالہ جشن ولادت منانا چاہتے ہیں۔

◆◆◆

کالم نگاری کا نگار خانہ

گلزار وفا چوہدری نے عطاء الحق قاسمی کو چھوٹے قاسمی صاحب کہا۔ بے ساختہ کہا اور برمحل کہا۔ کسی بھی سچ کو سوچ سوچ کر کہنے والے اسے ناقابل فہم بنا دیتے ہیں۔ ہماری حالت یہ ہے کہ جو بات ہماری سمجھ میں نہ آئے ہم اسے سچ کہہ دیتے ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ ماننے کے لیے جاننا ضروری نہیں۔ مگر جاننے کے لیے ماننا ضرور ہے۔ میں تو سیدھا سادا مسلمان ہوں۔ سو میں بڑے قاسمی صاحب اور چھوٹے قاسمی صاحب کو ماننے والوں میں سے ہوں۔ ایمان لانے کے بعد تحقیق کرتے پھرنا ایک احمقانہ فعل ہے۔ حماقتیں بلکہ مزید حماقتیں ہم سے سرزد ہوتی رہتی ہیں۔ مگر جب آدمی کو پتہ چل جائے کہ وہ حماقت کر رہا ہے تو حماقت کے اندر کی معصومیت تباہ ہو جاتی ہے۔ بڑے قاسمی صاحب اور چھوٹے قاسمی صاحب سے رابطہ دل میں بے ساختہ پن کو زندہ رکھتا ہے۔

عطا سے ایک بار خالد احمد نے پوچھ لیا کہ تم میں آخر کیا ہے کہ دوست اس طرح تم سے ٹوٹ کر پیار کرتے ہیں۔ یہ سوال نہیں تھا مگر خالد کو جواب مل گیا۔ جب عطا نے کسر نفسی یا تکبر کا کوئی روایتی تاثر نہ دیا۔ صرف مومنیت اور خوش نصیبی اور دوست داری کی ملی جلی لہر اس کے چہرے پر پرورش کرنے لگی۔ میں نے یہ تاثر بار بار دیکھا ہے میں جب محترمہ بانو قدسیہ کو ہسپتال ملنے گیا انہوں نے مجھ سے کہا کہ میرے لیے دعا کرو میں نے کہا کہ ہم تو آپ کو ولیہ سمجھتے ہیں۔ تو بانو جی نے اس کی تردید یا تائید میں تقریر نہیں کی۔ انہوں نے سر جھکا لیا۔ مرض مہلک سے ان کی شفایابی کچھ ثبوت تو ہے مگر میں اور بانو اور عطا کچھ ثابت نہیں کرنا چاہتے۔ کم از کم میں تو بالکل نہیں۔ میرے خیال میں کسی چیز کا مکمل ثبوت پیش کر دیا جائے تو اس کی نفی ہو جاتی ہے۔ تو عطاء الحق قاسمی کی مشہور مقبولیت نہ کسی چیز کا ثبوت ہے نہ نفی ہے۔ اس کی شخصیت کی خوئے دلنوازی کا ردعمل ہے۔ مشہور آدمی تو بہت ہوئے ہیں اور ہیں۔ مگر مشہور ہونے کے ساتھ ساتھ محبوب ہونا اور محترم ہونا کسی کسی کو نصیب ہوتا ہے امجد اسلام امجد بھی ہمارا دوست ہے دشمنی پالنے اور مرغیاں پالنے کے یکساں طور پر خلاف ہے۔ کہ اس طرح وقت ضائع ہوتا ہے۔ حالانکہ یہ دونوں چیزیں بنی بنائی بلکہ پکی پکائی مل جاتی ہیں عطا اور وہ ''جڑواں دوست'' کے طور پر مشہور ہیں۔ انیس بیس کا فرق ان میں بھی ہے۔ اب امجد نے بھی کالم نگاری شروع کر دی ہے۔ کالم نگاری تو مستنصر حسین تارڑ نے بھی شروع کر دی ہے۔ انہوں نے اچھے کالم بھی لکھے ہیں۔ مگر مختلف جذبے ایک ہی عمل کی شخصیت بدل کر رکھ دیتے ہیں۔ میں یہ بات پورے یقین سے کہہ رہا ہوں کہ عطا کے دل میں کسی کے لیے کوئی برا جذبہ نہیں پیدا ہوتا۔ پیدا ہو جائے تو بچپن ہی مر جاتا ہے کچھ لوگ

برے جذبوں کو خاصا بزرگ کر کے اپنے اندر رکھ لیتے ہیں۔ رات دن اس کی خدمت میں لگے رہتے ہیں اور خود بچپن ہی میں بوڑھے ہو جاتے ہیں۔ جبکہ بڑھاپے میں بھی آدمی کے اندر بچہ موجود رہنا چاہیے میں سفر و حضر میں عطا کے ساتھ بہت رہا ہوں۔ عطا ایک کھلنڈر بچے کی طرح شریر سچا اور گہرا ہے بچے سے زیادہ دوسروں کی فکر رکھنے والا لحاظ کرنے والا کوئی نہیں ہوتا البتہ ہنستے کھیلتے بچے کو اس وقت بھی دیکھئے جب وہ اداس ہو یا رونے کے فوراً بعد تنہا بیٹھا ہو میں نے اتنی سچائی کے ساتھ محویت اور ڈوبی ہوئی کیفیت کہیں اور نہیں دیکھی۔ بچے اپنی ذات میں بے نیازی کی بادشاہت کے مالک ہوتے ہیں۔ مگر اس بے نیازی اور نیازمندی میں آسانی سے فرق نہیں کیا جاسکتا۔ جس نے بڑی عمر میں بھی بچپن کو سلامت رکھا۔ اس کے لیے سلامتی ہے اور کچھ نہ سہی بچہ اپنی معصومیت اور بھولپن کی وجہ سے دشمن شخص کو بھی پیار بھری نظر خود پر ڈالنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ خدا بھی بچے کو کسی غلطی پر کچھ نہیں کہتا جب تک وہ بالغ نہ ہو جائے۔ میرا ایمان ہے کہ بچے کی سی معصومیت اور نیک نیتی سے گناہ کیا جائے تو وہ گناہ تو ہوتا ہے۔ اتنا گناہ نہیں ہوتا بہر حال میں عطا کے ایسے گناہوں کی فہرست نہیں گنوانا چاہتا اور نہ اس کے ایسے کارنامے بیان کرنا چاہتا ہوں۔ یہ کیا کم کمال ہے کہ اس نے اپنے لیے دوستوں کے دل میں محبت کو زندہ رکھا۔ آج کل لوگ ایک دوسرے سے محبت رکھنا بھولتے جارہے ہیں۔ وہ ایک دوسرے پر صرف شک اور حسد کی نظر ڈالتے ہیں بلکہ رکھتے ہیں سنا ہے بچپن اور بہشت کی سرحدیں ایک دوسرے سے ملی ہوئی ہیں۔ میرا یہ خیال ہے کہ عطا اس دنیا میں بھی بہشت میں رہا ہے جسے اس بہشت کی جھلک دیکھنے کی طلب ہو عطا کا دوست بن جائے اور اس کا دوست بننا کسی دوسرے آسان کام کی طرح آسان ہے۔ اگرچہ اب دوستی انسان کا ایک گمشدہ وصف ہے۔ کچھ لوگوں سے صرف جان پہچان پیدا کرنے کے لیے آدمی کو کم از کم دوبارہ پیدا ہونے کی ضرورت ہے۔

کالم نگار عطاء الحق قاسمی دوست عطاء الحق قاسمی سے بلکہ عطاء الحق قاسمی سے مختلف نہیں۔ میں اس کالم نگاری کو سالم نگاری کہتا ہوں۔ اس نے اس فن کو مکمل کر دیا ہے۔ فکاہیہ اور مزاحیہ میں فرق کم سے کم رہ گیا ہے عطا نے اسے ''عطائیہ'' بنا دیا ہے۔ اب کالم نگاری ایک نگارخانہ بن گئی ہے ہمارے کئی ادیب دوست کالم نگار بھی ہیں مگر اپنی اس حیثیت کو چھپائے رہتے ہیں۔ جس طرح لنڈے کی سویٹر چھپانے کے لیے اسے قمیض کے نیچے پہن لیا جاتا ہے۔ شاید اسی لیے ان کالموں میں ادبی ترفع پیدا ہونے نہیں پاتا۔ عطا اس کمپلیکس کا شکار نہیں ہوا۔ کوئی کمپلیکس اسے شکار نہیں کر سکا۔ نہ اس نے کسی کمپلیکس کو شکار کرنے کی کوشش کی ہے۔ کچھ لوگ سمجھتے ہیں کہ شاید یہ کوئی مختلف کام ہیں ''عطایئے'' ''خندمکرر'' اور ''جرم ظریفی'' کے نام سے اس کے جو مضامین کتابی صورت میں شائع ہوئے ہیں۔ وہ تقریباً سارے نوائے وقت کالم کے طور پر چھپ چکے ہیں۔ اس نے ادب وصحافت کو گلے ملنے پر راضی کر لیا ہے۔ جب

ادیب کالم لکھے گا تو وہ کچھ نہ کچھ تو ادب لکھے ہی گا۔ احمد ندیم قاسمی کے کالم غیر ادبی تحریر نہیں ہو سکتے۔ عطا کی کتاب ''روزن دیوار سے'' منو بھائی کی ''جنگل اداس ہے'' اور جمیل الدین عالی کی ''تماشا میرے آگے'' نری صحافتی سرگرمی تو نہیں۔ جب عطا نے اپنے اخبار میں ادبی ایڈیشن کا آغاز کیا تھا تو ادب کے کچھ خود ساختہ کھڑپینچوں نے اسے ادب کے خلاف ایک سازش قرار دیا تھا۔ اب وہی لوگ ادبی ایڈیشنوں میں اپنی لابی بنانے کے لیے تن من دھن کی بازی لگائے ہوئے ہیں۔ ان دنوں اپنا یار حسن رضوی بھی ان لوگوں کی سازشوں کی زد میں ہے۔ عطا اگر ادبی ایڈیشن شروع نہ کرتا تو حسن رضوی ایڈیشن انچارج کیسے بنتا صحافی دنیا میں۔ یہ ادبی سرگرمی ادیبوں، شاعروں کو عوام سے متعارف کرانے کا وسیلہ بنی۔ اس طرح شعر و ادب عام لوگوں کے گھروں میں پہنچا دیا گیا۔ لوگ ٹی وی کے چار ڈرامے لکھنے سے اتنے مشہور نہیں ہوتے جتنے ان ایڈیشنوں میں چند سطریں لکھنے سے ہو جاتے ہیں۔ یہ کوئی جملہ معترضہ نہیں کہ امجد اسلام امجد کے ''وارث'' کی وجہ سے پاکستان ٹی وی کے ناظرین میں اضافہ ہو گیا۔ کئی لوگ یہ دونوں کام کر کے بھی کوئی کام نہیں کر سکتے۔ نجانے کیوں یہ فقرہ لکھنے سے میں اپنے آپ کو نہیں روک سکا کہ کسی زمانے میں ادیب و شاعر صحافی کا آئیڈیل ہوتا تھا۔ اب صحافی ادیبوں شاعروں کا آئیڈیل ہے۔ اس فقرے میں چھپی رمز اور طنز کو چھیڑے بغیر میں یہ کہوں گا کہ آض وہ لوگ سرخرو ہیں جن میں یہ دونوں صفات یا منصب یکجا ہو گئے ہیں۔ ایسے لوگوں کی مختصر ترین فہرست بھی بنائی جائے تب بھی اس مین عطا کا نام ہوگا۔ ایک محفل میں ادب و صحافت کے درمیان دیوار بنا کر اس کے اوپر چڑھ کر ایک خود ساختہ ادیب نے کہا کہ ادب دیر تک محفوظ رہتا ہے اور کالم کی زندگی صرف ایک دن ہے۔ تو عطا نے کہا کہ شیر کی ایک دن کی زندگی گیدڑ کی سو سالہ زندگی سے افضل ہے۔ اس ایک فقرے میں عطا کی کالم نگاری کی ساری خصوصیات پوشیدہ ہیں۔

یہ بات ایک بار محمد منشا یاد نے کی تھی کہ میں نے افسانہ شاعری اور کالم ایک ساتھ لکھنے کی کوشش میں احمد ندیم قاسمی بننے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ یہ ناکامی کامیابی کی متضاد چیز نہیں۔ عطاء الحق قاسمی نے اسی انداز میں کوشش کی اور کامیاب رہا۔ یہ کامیابی ناکامی کے مقابلے کی شے نہیں جب آدمی سچی طرح کوئی کام کرتا ہے تو کامیابی اور ناکامی اپنے معانی اور اثرات بدل لیتی ہیں عطا اگر ایک صنف سخن میں محدود یا مقید رہتا تو خوار ہوتا۔ اس کے لہو میں جو آتش فشاں ہے۔ اسے زیادہ دیر تک روکے رکھنا اور اظہار کے صرف ایک احاطے میں بند رکھنا خود اس کے بس میں نہ تھا۔ اس بے بسی اور بے تابی نے مل کر اسے بے حساب کیفیتوں سے مالا مال کر دیا۔ اس کی مثال اس دریا کی سی ہے جس میں ہلکی ہلکی طغیانی آئی ہوئی ہو۔ یا ہوا جو ذرا تیزی سے چل رہی ہو۔ آپ انہیں کیسے روک لیں گے کہ اس کھیت میں سے گزرے اور اس میدان میں نہ جائے۔ کم از کم دائیں دروازے میں سے نہ جائے۔ میں یہ جانتا ہوں کہ

آتش فشاں سے نقصان بھی ہوتے ہیں۔ دریا چڑھتے ہیں تو بہت کچھ بہا کر بھی لے جاتے ہیں۔ ہوا کو پتے گرانے اور آنکھوں میں مٹی ڈالنے سے باز نہیں رکھا جاسکتا۔ عطا کی کئی تحریروں میں سے بھی اس کے خلاف مقدمات بنائے جاسکتے ہیں۔ اطلاعاً عرض ہے کہ مقدمات سے زیادہ یہ لفظ ''بھی'' خطرناک ہے۔ اگر یہ کاروائی سیاہی اور منافقانہ نہ ہو تو جج سمیت تمام مدعی اور مخالف بھی ایک سرخوشی سے لبالب ہو کر عطا کے گرویدہ نہ ہو جائیں تو آپ مجھ پر مقدمہ دائر کر دیں۔ کالم شاعری سفرنامہ اور مزاح اور ڈرامے میں ہر طرف اس کی دلبری دلکتی اور کھنکتی نظر آتی ہے۔ اس کا ٹی وی ڈرامہ خواجہ اینڈ سن بھی اپنی مسکرائی ہوئی دلکشی کے سبب بے پناہ مقبول ہوا ہے اکثر لوگ ''ہرفن مولا'' بننے کے شوق میں اپنی بے ہنری کے سبب نامراد ہوئے ہیں۔ ہر کہیں نظر آنے والی رنگا رنگی میں ملوث ہو کر بے رنگ ہونے والوں کی تعداد بھی کم نہیں ادب وفن کی تحصیل اور ترسیل کے تنوع سے جو خزانہ ہاتھ آتا ہے اسے نبھانا بیک وقت مزیدار اور مشکل کام ہے وسعتیں اور کثرتیں خیالوں اور جذبوں کو فطرت اور فراست سے ہمکنار کرتی ہیں اور بے کنار بھی کرتی ہیں۔ زندگی اور معاشرت کا دوست فن کار وہ ہے جو اپنے مطالعہ کرنے والے کو اس منزل تک لے آئے یا لے آنے کی کوشش کرتا رہے جہاں بے کنار ہونا اور ہمکنار ہونا ایک ہی عمل اور ایک ہی کردار بن جائے۔ عطا کا ہنر یہ ہے کہ وہ بہت سے رستوں پر چلتا ہوا نظر پڑتا ہے۔ رستے جو بہت آگے جا کر ایک ہو جاتے ہیں۔ اس کے اندر وسعتوں منزلوں دوستوں' محفلوں' مسافتوں' خوشیوں' اور دردمندیوں کے ڈھیر ہیں جو نہ شمار میں آتے ہیں نہ قطار میں پتہ نہیں یہ شمار قطار والا محاورہ کس نے کیوں بنایا ہے۔

محاورے اور ضرب المثالیں عطا کے ہاتھو میں کچی ڈور سے بندھی پتنگوں کی طرح گھبراتی ہیں زندگی کے ہتھے چڑھ کر قطار ٹوٹ پھوٹ چکی ہے۔ فطرت کے پھیلاؤں میں اس کا وجود ہی نہیں عطا کسی ترتیب چڑھ کر قطار ٹوٹ پھوٹ چکی ہے۔ فطرت کے پھیلاؤں میں اس کا وجود ہی میں عطا کسی ترتیب اور تنظیم کا قائل ہوگا۔ مگر وہ بے ترتیب ہونے اور غیر منظم اور بے تکلف ہونے کا بہت قائل ہے۔ وہ ایک بکھرا ہوا آدمی ہے بلکہ بکھرتا ہوا آدمی ہے اور بکھرتا ہوا آدمی ہی نکھرتا ہوا آدمی ہوتا ہے۔ اس کی زندگی رونقوں سے بھرے کھلے میدان کی سی ہے جہاں سارے موسم سارے وقت بڑے شوق محبت اور بڑی سہولت کے ساتھ سما جاتے ہیں۔ جہاں ہر طرح کے کھیل تماشے میلے ٹھیلے جلسے جلوس اور دوسرے اجتماعات ہو سکتے ہیں۔ ان کمروں کی طرح نہیں جہاں صرف مخصوص لوگوں کو داخل ہونے کی اجازت ہوتی ہے۔ اس کے ماتھے پر ''اندر آنا منع ہے۔'' لکھا ہوا نہیں وہ اجالے کی طرح اجلا آدمی ہے۔ وہ کسی گروپ باز منافق بزعم خود لکھنے والے یا لکھنے والی کی طرح ایک حویلی یا ڈرائینگ روم یا ایک دفتر کا ایک ادیب نہیں ڈرائنگ روم پالٹیکس اور دفتری کاروائی کی حقیقت سب جانتے ہیں۔ ایسے سیاستدانوں افسروں' کلرکوں اور ادیبوں شاعروں میں رتی برابر فرق

نہیں۔ یہ لوگ ہیں جو بیک وقت حکومت وقت کی مجلسی مخالفت اور حاکموں سے خفیہ تعلقات کے ذریعے فرائض منصبی انجام دیتے ہیں۔ یا انجام دیتی ہیں۔ وہ رابطے کے لیے کسی بیوروکریٹک ضابطے کو نہیں مانتا۔ نہ ہی چند سینئر امیر اور افسر دوستوں کے علاوہ کسی کا ادب پڑھنا اور ان سے تبادلہ خیال کرنا ہی اپنی کسر شان سمجھتا ہے۔ اس لحاظ سے چھوٹے بڑے کی تمیز اور امیر غریب کے فرق کا بھی مخالف ہے۔ یہ صرف ''انقلابی'' ادیبوں شاعروں کا شیوہ ہے۔ عطا کھلے لفظوں میں لیفٹ اور رائٹ کی ودعلی سیاست کی مذمت کرتا ہے۔ وہ پاکستان میں ایسے معاشرے کی تشکیل کا خواہش مند جہاں رہنا ایک اعزاز ہو اور ہم پاکستانی کی حیثیت سے ساری دنیا میں معزز ہوں میرے اور اس کے خیال میں پاکستانی ہونا بہر حال ایک اعزاز ہے۔

◆◆◆

متنازعہ تنقید کی مقبولیت

یہ صلاحیت بھی بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتی ہے کہ وہ اتنی سہولت سے لکھ سکیں جتنی آسائش سے ڈاکٹر سلیم اختر لکھتے ہیں۔ جبکہ تنقید کوئی انشائیہ نثری نظم یا ٹی وی ڈرامہ تو ہے نہیں۔ تنقیدی مضامین متواتر لکھنا پڑیں تو آدمی جلد بوڑھا ہو جاتا ہے بوڑھا لگنے لگتا ہے جیسے سراج منیر یا سینئر محسوس نہیں ہو رہے۔ یہ بات ان کے اندر حوصلے اور اپنائیت کے خزانے کا پتہ دیتی ہے۔ یقین مانیں کسی تقریب میں دو چار مضامین پڑھوائے پڑ جائیں تو مصیبت پڑ جاتی ہے۔ سب سے آسان کام مشاعرہ کرنا ہے لوگوں نے نجانے کیوں ''بگڑا شاعر نقاد'' جیسی ضرب المثل بنا رکھی ہے ہمارے ہاں لوگ بیک وقت اچھے شاعر اور اچھے نقاد ہیں ادب کو خانوں میں تقسیم کرنا مسائل پیدا کرنے کے مترادف ہے۔ تخلیق و تنقید دو مختلف عمل تو ہیں نہیں۔ ڈاکٹر سلیم اختر شاعر نہیں۔ افسانہ نگار ضرور ہیں۔ یہ دونوں وصف یا اختیار مختلف حیثیتوں میں تو کسی کے وجود کا حصہ نہیں ہوتے اگر ہوتے ہیں تو پھر نہ وہ نقاد ہوتا ہے نہ افسانہ نگار یا شاعر۔ بس لکھا ہوا حرف بے توقیر نہیں ہونا چاہیے۔ آپ اسے کہیں بھی رکھ دیجئے۔ وہ پڑھنے والے کو صاحب توقیر بنا دے گا مجھے ڈاکٹر سلیم اختر کے افسانوں میں تنقیدی شعور کی چمک نظر پڑی اور ان کے تنقیدی مضامین میں تخلیقی کیف کا احساس ملا۔ تنقیدی ذوق بڑھانے کے لیے ایک بے نام سے انبساط کا تاثر بہت ضروری ہے۔ تنقیدی پڑھتے ہوئے سر میں درد ہو جائے۔ ایک بوریت بھری اکتاہٹ بورے سراپے میں گھلتی جائے تو آدمی پڑھنے کی عادت ہی گنوا بیٹھتا ہے۔ ہمارے ہاں کئی نقادوں نے لوگوں کو ادب کے دائرے سے باہر رکھنے کی کامیاب کوششیں کی ہیں اس لیے بالخصوص تنقید پڑھنے والوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہے۔ شاعروں پر طعن و تشنیع کے باوجود ان کی مقبولیت کچھ معنی رکھتی ہے۔ افسانے پڑنے والوں کی تعداد بھی خاصی ہے۔ اس کے باوجود کچھ لکھنے والوں نے تجریدیت اور علامت سازی کے سہارے پڑھنے والوں کی حوصلہ شکنی میں کوئی کسر نہیں چھوڑی کیا کبھی ایسا بھی ہوگا کہ کوئی نقاد کسی شاعر یا افسانہ نگار کی طرح دلوں میں جگہ بنائے گا اور لوگ تنقید پڑھنے یا سننے کے لیے نکیل پکڑے ہوئے اونٹ کی طرح نہیں لائے جائیں گے میں نے محمد حسن عسکری سلیم احمد ڈاکٹر ابوالخیر کشفی فتح محمد ملک، ڈاکٹر اجمل، انیس ناگی، ڈاکٹر سہیل احمد اور سراج منیر کے علاوہ ڈاکٹر سلیم اختر کے مضامین پڑھنے میں ہمیشہ کشش محسوس کی ہے۔

میرے نزدیک ڈاکٹر سلیم اختر کی مقبولیت اس کے افسانوں سے کہیں زیادہ اس کے تنقیدی مضامین کی وجہ سے ہے۔ وہ ایک

مقبول نقاد کے طور پر اپنی حیثیت مستحکم کر چکا ہے۔ جب مقبول شاعروں اور مقبول نثر نگاروں کے ساتھ مقبول کی تعداد میں بھی اضافہ ہوگا ادب کے طالب علم کے لیے کچھ اور کشادگی ہوگی۔ واضح رہے کہ نقاد کی مقبولیت شاعر کی مقبولیت سے بہت مختلف خصوصیت ہے تنقید لکھنے والے کا ایک انداز یہ بھی ہے کہ وہ پڑھنے والوں کے لیے تقسیم شعر و ادب کے معاملے میں آسائشیں مہیا کرے اور ادب کے لے طالب علم کے تنقیدی رجحان کو ایک سوچ بھرے رستے کی طرح پھیلاتا چلا جائے۔ تاکہ لوگوں کے دل میں نقادوں کے لیے تجسس اور دلکشی کی فضا پیدا ہوا۔

ادب کی دنیا میں نقاد ایک دہشت پھیلانے والے کا کردار ادا کرتا ہے لکھنے والے اور اب پڑھنے والے بھی نقاد سے ڈرتے ہیں جس طرح شریف شہری علاقے کے جاگیر دار سے۔ ادب کے علاقوں میں جاگیر داری نظام قائم کرنے کی کامیاب کوششیں ہو رہی ہیں۔ نقاد کی خوشامد میں منافقت کا خوف بھرا ہوا ہوتا ہے۔ یہ عزت بہت پھسپھسی اور عارضی ہوتی ہے۔ ایسے میں یہ ایک انوکھی حیرت کا تجربہ ہے کہ نقاد کے لیے دل میں محبت بھی پیدا ہو سکتی ہے۔ وہ لکھنے والے کا ایسا دوست ہو سکتا ہے جس کے بارے میں حضرت عمر نے کہا ہے کہ میرا سب سے بڑا خیر خواہ وہ ہے جو مجھے میری خامیوں سے آگاہ کرتا ہے۔ مگر ہمارے ہاں کوئی کسی ادیب و شاعر کی خامی کی طرف اشارہ تو کر کے دیکھے پھر ڈھیکھے کہ اس کا حشر کیا ہوتا ہے۔ البتہ اشارہ کرنے والا بھی جانتا ہو اور بتا سکا ہو کہ خامی کو خوبی میں کس طرح بدلا جا سکتا ہے تو بات الگ ہے مگر اس کے علاوہ بھی ایک بات ہے جس کا ذکر کر کے میں اپنے اور ڈاکٹر سلیم اختر کے لیے مصیبت کو دعوت نہیں دینا چاہتا خامی کو جانتے ہوئے بھی اس پر خوبی کا اصرار کرنا تو صاف غنڈہ گردی ہے ورنہ ادبی غنڈہ گردی تو پھر کسی حد تک مہذب حرکت ہو سکتی ہے۔ یہ جواب میں گروہ بندیوں کا ہجوم ہے۔ یہ ضد اور حسد کی صورت حال کا نتیجہ ہے۔ مقابلہ اور مخالف شریفانہ عادتیں بھی ہوتی ہیں بشرطیکہ تکبر اور انتقام کی آگ آدمی کو اندھا نہ کر دے۔ اپنے خلاف جائز اور سچی بات بھی برداشت نہ کرنا۔ پڑھے لکھے لوگوں کا شیوہ ہرگز نہیں۔ رائے دیتے وقت دوستوں اور دشمنوں کو الگ الگ بانٹ لینا بندر بانٹ سے مختلف کام تو نہیں پھر یہ بات بھی تو اہم ہے کہ جس طرح حق میں بات کرنے کا ایک سلیقہ ہے۔ اسی طرح خلاف بات کرنے کا بھی ایک قرینہ ہے جو نقاد ان اوصاف سے عاری ہے اسے تنقیدی نگاری سے اپنے آپ کو بچانے میں کوئی عار محسوس نہیں کرنی چاہیے ایسے خطرناک ماحول میں بہت سے مختلف گروہوں میں گھرے ہوئے لکھنے والوں میں ایک جیسی اپنائیت کا مقام حاصل کرنا بہت مشکل ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ڈاکٹر سلیم اختر نے کبھی کسی کے خلاف لکھا ہی نہیں۔ وہ ایک متوازن طرز تنقید کے قائل ہیں انہوں نے ایک ادیب کے حق میں لکھا۔ اس کے خالف بھی لکھا پہلے وہ ان کا دوست تھا۔ اب دشمن ہے اس کے بعد اس کے سارے دوستوں کا

ایک مشینی اور انداز بھی دشمن ہو جانا لازمی بات تھی۔ ڈاکٹر سلیم اختر ایک شاندار استقامت کے ساتھ اپنے موقف کی نگہداشت میں ڈٹے ہوئے ہیں ورنہ لوگ اس لڑائی میں سب کچھ جائز سمجھتے ہیں۔ نجانے اس ضمن میں محبت اور لڑائی کو ایک ساتھ کس انداز میں استعمال کیا گیا ہے۔ محبت اور لڑائی کے سلسلے میں کوئی بھی قدر مشترک باقی رکھی جائے تو یہ نوبت تو نہ آئے کہ گھمسان کے رن میں لفظ کی پاسبانی کے دعویدار اپنی حفاظت کے زور میں سب کچھ برباد کر بیٹھتے ہیں۔ ڈاکٹر سلیم اختر اس میدان کے ایک اچھے سپاہی ہیں۔ جن کے دل میں سپہ سالار بننے کی کوئی تمنا تڑپتی نہیں اس لیے اس کے ساتھی ایک دوسرے کے جانثار ہوتے ہیں۔ اور یہ پتہ نہیں چلتا کہ کس وقت کون کس کے خلاف لڑ رہا ہے ڈاکٹر سلیم اختر کے کئی شاگرد بھی اب ڈاکٹر اور جو ''کمپونڈر'' ہیں وہ بھی اچھے خاصے پریکٹیشنر ہیں۔ ان کے لکھے سے لفظ شفایاب نہ بھی ہوں تو کم از کم مرتے تو نہیں۔ لوگوں نے صرف اپنے ارادوں کو معذرو زندگی دینے کے لیے لفظوں کا قتل عام شروع کر رکھا ہے۔ جبکہ تنقید لکھنے کے لیے صرف بہادری کی ضرورت ہے اور بہادر کبھی ظالم یا خودغرض نہیں ہوتا۔ ڈاکٹر طاہر تونسوی تو خیر ڈاکٹر صاحب کی فتح وشکست میں برابر کا حصہ دار ہے۔ وہ لوگ بھی اب ڈاکٹر صاحب کے دوست بن رہے ہیں یا بقول حضرت علی ان کے دشمن بن رہے ہیں کہ جو لڑائیوں میں اتنے غیر جانبدار ہوتے ہیں کہ صلح وصفائی کرانے میں بھی دلچسپی نہیں لیتے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ڈاکٹر سلیم اختر ایک دانا دشمن ہے۔

ادیب دوست سلیم صاحب سے محبت رکھتے ہیں اور ان کی عزت بھی کرتے ہیں یہاں مجھے پھر فتح محمد ملک یاد آتے ہیں۔ انہوں نے ''فیض دو آوازیں'' کے نام سے ایک مضمون فیض کے خلاف لکھا۔ مگر اپنی نیک نیتی اور سچائی کی بدولت کسی الزام یا سازش کی زد میں نہیں آئے۔ مگر ان کا کیا کیا جائے جو اصولی اور فنی اختلاف کو بھی ذاتی دشمنی کے نیزے پر چڑھا کر میدان میں اتر آتے ہیں۔ لڑائی اور دشمنی کے لفظ کو بھی بدنامی سے داغدار کر دیتے ہیں۔ نقاد صرف خرابیوں پر ہی نظر نہیں رکھتا۔ اور وہ صرف خوبیوں کو ہی تلاش نہیں کرتا رہتا اس کا کام ان دونوں صورتوں سے گزر کر ایک ایسی فضا بنانا ہے جہاں پہنچ کر لکھاری خود اپنی نگاہ سے سب کچھ دیکھ سکے۔ ڈاکٹر سلیم اختر اس میدان میں سب کے ساتھ پہنچنا چاہتے ہیں۔ انہیں ابھی بہت رکاوٹوں کو دور کرنا ہے اور ان سے بھی نپٹنا ہے جو برابر رکاوٹیں کھڑی کرنے میں پوری تندہی سے مشغول ہیں۔ اس وقت جو تصویر ابھر رہی ہے وہ ایک متنازعہ شخصیت کی ہے۔ ڈاکر سلیم اختر متنازعہ ہیں۔ نہ صرف گروہی لیڈر شپ سے تصادم کی وجہ سے بلکہ مختلف ادبی معاملات میں اپنے مخصوص تصورات کی وجہ سے انہوں نے اقبالیات پر لکھتے ہوئے اپنا ایک جدا فکری محاذ تلاش کیا اور ایک علیحدہ میدان تیار کیا ہے یہ اقبال دوستوں اور اقبال مخالفوں کے درمیان ایک مقام ہے۔ دونوں طرف سے سوچنے والوں سے اختلاف کے باوجود ایک مثبت نقطہ نظر دریافت نہ کرنا بڑی بات ہے۔

واضح رہے کہ میں یہاں ڈاکٹر صاحب سے اتفاق یا اختلاف نہیں کر رہا۔صرف ان کے رجحان کی بات کر رہا ہوں دانشوروں نے اقبال کی شاعری کے ذریعے فکری اور ملی فراخی کی کئی دنیائیں تلاش کیں۔ڈاکٹر صاحب نے ان کے خطوط نکال کر ان کی مردانگی ثابت کرنے کی کوشش کی۔اقبال کی شاعری میں آدمی ایک عظیم عورت سے ہمکلام ہوتا ہے۔

فاطمہ بنت رسول فاطمہ بنت عبداللہ ان خطوط میں ایک مکمل عورت سے مکالمہ کرتا ہے اس میں عطیہ فیضی کے علاوہ بھی کئی نام آتے ہیں۔فرد کی یکتائیت ایک پورے مرد کی شان کے بغیر کیسے ممکن ہے۔ڈاکٹر سلیم اختر کہتے ہیں کہ بڑا آدمی بھی آدمی ہوتا ہے اسی لیے اقبال ایک مکمل عورت کی آرزو میں مبتلا رہے۔اس طرح لوگوں نے سمجھا کہ سلیم صاحب اقبال کے کچھ مخالف ہو گئے ہیں اور عورتوں کے کچھ زیادہ حامی ہو گئے ہیں حالانکہ عورتوں نے ان کے حق میں کوئی جلوس وغیرہ نہیں نکالا۔بھلا مرد مومن کا تصور دینے والا اقبال ایک غیر مکمل عورت کے ساتھ کیسے گزارا کر سکتا تھا۔اقبال کی ازدواجی زندگی کی بے چینی کا راز معلوم کرنے کی خواہش نے ڈاکٹر سلیم اختر کو معتوب بنا دیا۔اس کے علاوہ جب اور نفسیاتی معاملات بھی ان کی تحقیق کی گرفت میں آئے تو اور بھی مسائل پیدا ہوئے اور ڈاکٹر سلیم اختر کو تنقید کے نفسیاتی دبستان یعنی سکول کا ہیڈ ماسٹر بنا کر کھڑا کر دیا گیا حالانکہ انہوں نے کبھی خود اس کا دعویٰ نہیں کیا۔اسی طرح ادب کے پرائیوٹ سکولوں کے خودساختہ ہیڈ ماسٹروں نے فائدہ اٹھانے کے لیے کئی اعلانات بھی کیے مگر بات ان کے خلاف ہی ٹھہری۔اب اس میں ڈاکٹر سلیم اختر کا کیا قصور ہے ڈاکٹر سلیم اختر کا ایک اور کارنامہ اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ ہے جس نے بقول عطاء الحق قاسمی مقبولیت کے ریکارڈ قائم کر دیے ہیں۔یہ صرف ایک مختصر ترین تاریخی جائزہ نہیں ایک مربوط تنقیدی تجزیہ بھی ہے۔ بہت تھوڑے وقت میں بہت دلچسپی اور سہولت سے کوئی بھی نیا آدمی اردو ادب کے پورے منظرنامے کا مشاہدہ کر سکتا ہے اور اس کی توسیع کی رفتار کا اندازہ بھی کر سکتا ہے۔ڈاکٹر سلیم اختر ہر دوسرے تیسرے سال اس کتاب کا نیا ایڈیشن نئے سرے سے مرتب کر کے چھاپ دیتے ہیں۔اس میں تبدیلیاں ایک مثبت تجزیے کے ساتھ موجود ہوتی ہیں۔اور نئے لمحوں میں تخلیق ہونے والے ادب کا اضافی جائزہ بھی شامل ہوتا ہے میں کئی لوگوں کو جانتا ہوں جن کے پاس اس کتاب کا ہر تازہ ایڈیشن موجود ہے۔یہ بات تاریخ و تنقید کے میدان میں ایک حیرت انگیز جدت کے طور پر یاد رکھی جائے گی۔لوگ ادبی تاریخ کے آگے بڑھنے کا نظارہ بھی کر سکیں گے۔یہ کتاب پڑھتے ہوئے کہیں کہیں یہ احساس بھی ہوتا ہے کہ تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے۔میں اپنا یہ جملہ دہراتا ہوں کہ ڈاکٹر سلیم اختر ایک متنازعہ مگر مقبول نقاد ہیں۔میری اس رائے میں ان کے مختلف تقریبات میں پڑھے جانے والے مضامین کی پسندیدگی کا تاثر بھی ہے۔وہ ان سارے مضامین کو ہی چھپوانے لگیں تو صرف ان کی کتابوں سے ایک پورا کتب خانہ بن جائے۔ماشاء اللہ اب بھی ان

کتابوں کی تعداد بہت زیادہ تو بہت کم بھی نہیں۔

ڈاکٹر صاحب کے شاگردوں کی ایک فوج بھی ادب کے میدان میں اتری ہوئی ہے اس کا کچھ تو کریڈٹ ڈاکٹر صاحب کو جاتا ہے کہ یہ سب لوگ اپنا اپنا منفرد مقام بنا چکے ہیں۔ ڈاکٹر انوار احمد اصغر ندیم سید اور ڈاکٹر طاہر تونسوی کی تحریری کراچی کے ادبی ماہنامے ''الفاظ'' کے ڈاکٹر سلیم اختر نمبر میں موجود ہیں۔ یہ رسالہ ڈاکٹر صاحب کے بارے میں دوست تحریروں کے حوالے سے یاد رکھا جائے گا۔ اب طاہری تونسوی نے ڈاکٹر صاحب کے بارے میں ایک ضخیم کتاب لکھ دی ہے۔ جس کا نام ''ہمسفر بگولوں کا'' رکھا گیا ہے۔

بعض اقات زندہ شخصیات پر کتابیں لکھی گئیں تو وہ زندہ تر ہو گئیں۔ ایسی کتابوں کے ذریعے لوگوں کو اپنے ہم عمر ہمعصر اور کسی نہ کسی راستے پر ہمسفر آدمی کی رفاقت اور اہمیت کا انداز ہوتا ہے اور اسے ایک اور انداز سے پا لینے میں آسانی ہوتی ہے۔ ہم کسی شخص کو بکھرتے رنگوں میں تلاش کرتے رہتے ہیں کبھی نکھرتے موسموں میں اس کی تصویریں دیکھتے رہتے ہیں۔ یہ بھی اپنی اپنی جگہ پر انوکھے اور مزید عمل ہیں۔ جب اس شخص کو ایک مرکز میں جمع ہوتی ہوئی کیفیتوں دیکھا جاتا ہے تو اس کے ساتھ اپنے آپ کو بھی معلوم کرنے کی تمنا اپنے قریب تر محسوس ہوتی ہے پہلے زمانوں میں جو ایسی کوششیں کی گئیں وہ سراسر سوانح عمری کے ذیل میں چلی گئیں۔ لیکن اس طرح کے ادبی کام کو کوئی اور نام دینا ہوگا لیکن میں یہ کوئی باقاعدہ کسی صنف سخن کے آغاز کا اعلان نہیں کر رہا اور نہ اس کے لیے کسی کو سربراہ مقرر کرنے کی بات کر رہا ہوں۔ میرے خیال میں تمام اصناف کا آغاز اس وقت سے ہو چکا ہے۔ جب انسان نے اپنے اظہار کے لیے سخن آغاز کیا تھا۔

ہمارے یہاں اس طرح کی کتابیں شائع ہو رہی ہیں جس میں ایک شخصیت کے بارے میں وافر مہیا کر دیا جاتا ہے تاکہ اس کے بارے میں تحقیق و تجزیے میں آسانی ہو اس سلسلے میں بھی کبھی کبھی جوابی کاروائی کا گمان بھی ہونے لگتا ہے۔

بہر حال ایسی کتابوں سے ادبی رونقوں میں اور اضافہ ہونے کا امکان ہے علم و ادب کے شہروں میں اس طرح کی سرگرمیاں بازار گرم رکھنے کا بہانہ ہیں مقابلہ مثبت نتائج پیدا کرے تو اس سے بڑ نعمت کیا ہوگی۔ مگر ہمارے ہاں ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی روش نے ہنگامے کی سی فضا پیدا کر رکھی ہے جس انداز میں لوگ مقابلے پر اترے ہوئے ہیں تو خطرہ ہے کہ کہیں تاریخ انسانی کی طرح تاریخ ادب بھی جنگوں اور سرد جنگوں کی کہانی نہ بن جائے۔

میں کسی ادبی معرکہ آرائی بلکہ محاذ آرائی کا ذکر کر کے ایک اچھی بات کو الجھانا نہیں چاہتا مگر ڈاکٹر طاہر تونسوی کی ڈاکٹر سلیم اختر کے بارے میں یہ کتاب دیکھ کر میں نے محسوس کیا ہے کہ کوئی کام کرنے کے لیے کشمکش کتنی ضروری ہے۔ کبھی کبھی چپقلش بھی ضروری ہوتی

ہے۔اس لحاظ سے ''ہمسفر بگولوں کا'' کا مطالعہ بڑی اہمیت رکھتا ہے تلاش میں مشکلات نہ ہوں تو کسی بڑی چیز کے حصول کی امید نہیں ہوتی اور نہ کوئی مزا آتا ہے۔روشنی ہمیشہ تاریکیوں میں ملتی ہے۔طاہر نے اپنی کتاب میں ایک باب کا نام ہی ''باطل کی تاریکیوں میں روشنی کا متلاشی'' رکھا ہے ایک محقق کے لیے دوسرے محقق کا یہ خطاب برمحل ہے۔ادیب کا کام ہی تلاش ہے۔یہی وہ مقام ہے جہاں تحقیق اور تخلیق گلے ملتے دکھائی دیتی ہے۔جب انہیں جدا جدا کرنے کی کوشش کی گئی تو معاملہ ہی الٹ گیا۔وہ لوگ جنہوں نے زندگی میں تخلیقی کام بھی کیا ہو۔جب تحقیق کی طرف مائل ہوتے ہیں تو بہتر نتائج برآمد ہوتے ہیں۔افسانے کے میدان میں ڈاکٹر سلیم اختر کا کام ایک خاص حیثیت رکھتا ہے اور اب انہیں تحقیق کے میدان کا بھی مرد بلکہ مرد غازی مان لیا گیا ہے۔تحقیق و تخلیق فطرت علمی و ادبی کے اندر دور تک پھیلتے ہوئے سلسلوں کی بازیافت ہے۔

ذوق کسی طرح کا ہو سچا ہو تو عمل میں اسرار پیدا ہو جاتے ہیں۔جب اسرار پیدا ہوں تو کسی نہ کسی شکل میں انوار بھی پیدا ہوتے ہیں جس نے انوار و اسرار کو پا لیا پھر ان کو ملا لیا وہ اہل ذوق اہل درد اور اہل قلم میں سے ہو گیا۔ڈاکٹر سلیم اختر کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انہوں نے اردو ادب میں چند خاص حوالوں سے گہما گہمی پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔نفسیاتی معاملوں میں جنسی مسئلوں کو چھیڑا ہے۔تو جناب یہ چھیڑ چھاڑ ڈاکٹر سلیم اختر کو منفرد کر گئی۔اس چھیڑ چھاڑ میں ذوق وشوق کی مہک اور چمک تیز کرنا ایک تخلیقی عمل ہے۔ جب کوئی عمل تخلیقی تجربہ بھی بن جاتا ہے تو اسے ممنوع قرار نہیں دیا جا سکتا۔جنسی معاملات تو بذات خود تخلیقی عمل کی فطری اور ازلی شکل ہیں۔اس حوالے سے ڈاکٹر سلیم اختر کے ساتھ اختلاف کیا جا سکتا ہے۔انہیں مسترد نہیں کیا جا سکتا۔ڈاکٹر طاہر تونسوی ڈاکٹر سلیم اختر کے تعاقب میں ان ممنوعہ علاقوں تک جا پہنچا ہے۔پھر جو مختلف نقادوں کے تجزیے کے روشنی میں اپنے تاثرات بیان کیے ہیں تو جی چاہتا ہے کہ اس ممنوعہ علاقے کو شارع عام بنا دیا جائے۔ڈاکٹر سلیم اختر نے انسان کی خواہشوں کی پاتال میں اتر کر افسانہ لکھا۔اس طرح کئی ناقابل بیان حقیقتوں کا سراغ لگایا ہے۔کسی عمل کے اندر چھپی حقیقتوں کو دوسروں کی حقیقت بنا دیا تخلیقی عمل ہے۔ان حقیقتوں کو اس طرح تلاش کرنا کہ وہ اپنے سارے معانی ظاہر کر دیں ایک تنقیدی کام ہے۔پھر ان تلاش کی جا چکی حقیقتوں کو دوسری حقیقتوں کی روشنی میں دیکھنے کی کوشش کرنا تحقیقی کام ہے۔یہ تلاش مکرر ہے۔تحقیق تلاش مکرر ہی ہے کا اور کیا مطلب ہوتا ہے ڈاکٹر سلیم اختر نے تحقیق تخلیق اور تنقید کی تکون بنائی ہے۔یہ تو اس فن کا حساب رکھنے والے ہی بتا سکے ہیں کہ وہ کہاں تک کامیاب ہوئے ہیں مگر اس طرح کا حساب کرنے والے اکثر لوگ احتساب کرنا شروع کر دیتے ہیں۔یہ کام بھی اپنی نیک نیتی میں کچھ کام ہو سکتا ہے جب بات احتساب سے آگے نکل کر استحصال کیطرف بڑھتی ہے تو بگڑ جاتی ہے افسوس یہ ہے کہ اب ہمارے ادب میں استحصالی طبقہ پیدا ہو چکا ہے اور خود

کو جائز بھی سمجھتا ہے کوئی بھی استحصال کرنے والا خود کو ناجائز خیال نہیں کرتا۔ ملکہ وہ تو جو کچھ کر رہا ہوتا ہے ایسے ثواب کا کام سمجھتا ہے اسی لیے تو علوم وفنون کے میدانوں میں بھی جاگیردارانہ اور سرمایہ دارانہ ذہنیت رکھنے والے اوپر آ گئے ہیں۔ اس کے نتیجے میں یہاں بھی طاقتی کشمکش شروع ہو گئی ہے۔ کشمکش کسی طرح کی ہو اس سے افراتفری تو پیدا ہوتی ہے۔ کبھی کبھی کسی نہ کسی رنگ کی کچھ انقلابی ادائیں بھی دیکھنے میں آ جاتی ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ انقلاب کے ثمرات پھر انقلاب دشمن لوگوں کی جھولی میں جا گرتے ہیں۔

میں ڈاکٹر سلیم اختر کے بارے میں ایک بھرپور کتاب کے مطالعے کے دوران انجانے کہاں چلا گیا ہوں۔ تحقیقی کام کی یہ بھی خوبی ہے کہ وہ ہر طرف گھومنے پر اکساتا ہے اور اپنے مطلب کی چیز نکال لانے کی کشش میں گرفتار رکھتا ہے۔ اس سلسلے میں غیر متعلق چیزوں کو اپنی چیز کہنے کی ضد بھی پیدا ہو سکتی اپنے موقف پر ڈٹ جانا منفی چیز نہیں مگر مخالفت برائے مخالفت بھی کوئی اچھی بات نہیں۔ ''سب اچھا'' اور ''سب برا'' کہنے کا رواج تو سیاست کی رہگزاروں میں ہے۔ ادبی میدانوں میں بھی سیاست دانوں کی کمی نہیں۔ سیاسی عمل زندگی میں جاری وساری ہے۔ اس سے اجتناب ممکن ہی نہیں لیکن ادب کو سیاسی مفادات کے لیے اور فسادات کرانے کے لیے استعمال کرنا قطعاً مستحسن نہیں سمجھا جا سکتا۔ کچھ لوگ اس طرح کا کردار ادا کرنے پر مجبور کر دیئے جاتے ہیں میں نے ڈاکٹر سلیم اختر کو متنازعہ نقاد کہا ہے۔ متنازعہ آدمی کا یہ مقدر ہے کہ وہ جتنا محبوب ہوتا ہے اتنا ہی معتوب بھی ہوتا ہے جس طرح جس آدمی کا کوئی دشمن نہ ہو وہ کسی کا دوست نہیں ہوتا جو آدمی کسی کے خلاف نہیں لکھ سکتا اس کی لکھی ہوئی تعریف بھی بے فیض ہوتی ہے۔

طاہر تونسوی نے ایک ٹھوس علمی اور تحقیقی کام کیا ہے۔ وقتی ضرورت کے تحت کیا گیا کام کتنا ہی موثر کیوں نہ ہو۔ اس کے اثرات کبھی ہیشگی حاصل نہیں کر سکتے کئی لکھنے والوں کا بیشتر کام اسی ذیل میں آتا ہے۔ مجھے ان لوگوں کے بری طرح ضائع ہونے کا دکھ ہے۔ مگر شاید انہیں کوئی دکھ نہیں۔ ڈاکٹر طاہر تونسوی کی یہ کتاب اب ایک حوالے کی کتاب کی حیثیت اختیار کر گئی ہے۔ اسے ڈاکٹر سلیم اختر کے خلاف بھی استعمال کیا جا سکتا ہے مگر اس طرح بھی بات آخر کار ان کے حق میں چلی جائے گی

ڈاکٹر سلیم اختر انتہائی شریف بلکہ شریف النفس انسان ہیں۔ خدا شریف آدمی کے شر سے محفوظ رکھے۔ یہ بات محاورتاً کہی گئی ہے۔ مگر بعض اوقات خیر کے فروغ کے لیے شر انگیزی کرنا پڑتی ہے۔ اس بات کا شیخ سعدی کے فلسفلے کوئی خاص تعلق نہیں۔ دروغ مصلحت آمیز بہ از راستی فتنہ انگیز ٹھنڈے آدمی کا غصہ خطرناک بلکہ عبرتناک ہوتا ہے۔ اب سے کچھ عرصہ پہلے تک سلیم اختر ایک نقصان نہ پہنچانے والے آدمی کے طور پر معروف تھے اور اب وہ اس کے برعکس کام کرنے میں بھی مصروف نظر آتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ اب اس کے سوا کوئی اور چارہ ہی نہیں۔ میں اس جھگڑے کو بیان کر کے اسے مزید جھگڑا بنانا نہیں چاہتا۔ جھگڑے ہمیشہ باتوں

کے ذریعے پھیلتے ہیں سنا ہے جنگل میں آگ بھی اسی طرح لگتی ہے اللہ خیر کرے۔

ڈاکٹر طاہر تونسوی نے ڈاکٹر سلیم اختر کو 'ہمسفر بگولوں کا کہا ہے بگولے صحرا میں ہوتے ہیں۔لیکن ظہیر کاشمیر کا شعر پڑھنے کے بعد کہا جاسکتا ہے کہ بگول دلوں میں بھی ہوتے ہیں اب دلوں میں اور صحراؤں میں کیا فرق رہا ہے۔

میں ہوں وحشت میں گم میں اپنی دنیا میں نہیں رہتا
بگولہ رقص میں رہتا ہے صحرا میں نہیں رہتا

اور میں سوچ رہا ہوں کہ سلیم اختر صاحب چمکدار رزمیلی اور پرسکون ریت پر چلنے والے لوگوں کے گروہ کا آدمی ہیں۔ریت پر چلنے سے آواز نہیں ہوتی۔اور قدموں کی چاپ سے بھی کوئی ڈسٹرب نہیں ہوتا۔ڈاکٹر سلیم اختر اونٹ کی چال چلتے ہیں۔اونٹوں کے قدموں سے تو سڑکوں پر بھی آہٹ نہیں ہوتی۔آج کل سڑکوں پر شوروغل کے حوالے سے یہ بات کتنی خیر بخش ہے ایک بات اور کہ صحراؤں میں اونٹ سے زیادہ تیز رفتار اور زیادہ صاحب استقامت اور کوئی مخلوق نہیں۔یہ بہت صبر شکر سے منزلوں پر منزلیں مارتا چلا جاتا ہے۔ایک دفعہ پانی پی لیتا ہے تو ہفتوں تک پیاس کا اظہار تک نہیں کرتا۔ڈاکٹر سلیم اختر کو اونٹ کی ان صفات اور خصوصیات کی روشنی میں بہت بامعنی انداز میں سمجھا جاسکتا ہے۔علم کی پیاس بجھا کر اب وہ مسلسل کام کرنے کی دھن میں مگن ہیں۔اونٹ کی عادت یہ بھی ہے کہ وہ ناراض ہوجائے تو اپنے دشمن کو معاف نہیں کرتا۔اونٹ بہت آ کر اس کاروائی پر مجبور ہوتا ہے لیکن یہ بات میں بڑی ایمانداری سے کہہ رہا ہوں کہ سلیم اختر جیسے متوازن آدمی کے لیے شتر کینہ کا لفظ قطعاً مناسب نہیں۔کینہ پرور اور طرح کے لوگ ہیں شتر کینہ ایک اصطلاح ہے۔اکثر اوقات اونٹ اپنے اس انتقام عمل میں حق پر ہوتا ہے۔صحراؤں میں بگولے ریت کو رقص میں لاتے ہیں۔یہاں اونٹ کی تیز خرامی بھی رقص ہی کا ایک انداز ہے۔بگولہ بلندیوں کی طرف سفر کرتا ہے۔اونٹ منزلوں کی طرف بگولے اونٹ کے اندر بھی ہوتے ہیں۔بلندیاں اور منزلیں اندر بھی ہوتی ہیں۔طاہر تونسوی نے ڈاکٹر سلیم اختر کو بگولہ نہیں کہا۔بگولوں کا ہمسفر کہا ہے۔یہ صاحب ہمت اونٹ ہی ہوسکتا ہے یا اونٹ پر بیٹھا ہوا شخص میں بحث ختم کرتا ہوں کہ کہیں یار لوگ سلیم اختر کو ادبی دنیا کا اونٹ ہی نہ کہنا شروع کردیں۔وہ شعر دیکھئے جو طاہر نے اپنی کتاب کے آغاز میں شامل کیا ہے۔

ہر چند بگولہ مضطر ہے اک جوش تو اس کے اندر ہے
اک رقص تو ہے اک وجد تو ہے بے چین سہی برباد سہی

ادب کے دشت میں ڈاکٹر سلیم اختر نے جو سیاحی کی ہے اب ڈاکٹر طاہر تونسوی بھی ان کے ساتھ ساتھ ہے۔وہ ان کے ہمسفر

لوگوں میں سے پہلے نمبر پر ہے۔ڈاکٹر سلیم اختر کے کام کو سمجھنے کے لیے یہ کتاب رہنما کا کام دے گی۔ بلکہ ہمسفر کے فرائض بھی سرانجام دے گی۔

یہ کتاب باقاعدہ ایک تحقیقی مشن کا درجہ رکھتی ہے یہ مکمل طور پر پی ایچ ڈی کا مقالہ ہے اس کا اندازو اہتمام قطعی طور پر تحقیقی مقالوں جیسا ہے بھارت میں ڈاکٹر صاحب کے فن وشخصیت پر ڈاکٹریٹ کے مقالے کے لیے کام یا جارہا ہے۔ وہ ڈاکٹر تونسوی کی یہ کتاب ہی ٹائپ کرا کے پیش نہ کردیں۔ یہ رواج اب بھارت کی یونیورسٹیوں میں عام ہورہا ہے البتہ طاہر تونسوی نے وہ حدو بلکہ ''حدود آرڈی نینس'' اپنے اوپر لاگو نہیں کرلیا جو پی ایچ ڈی کے مقالہ نگار پر پہلے سے لگادی جاتا ہے۔ڈاکٹر سلیم اختر کی شخصیت وفن کے مربوط مطالعے کے لیے اس کتاب سے بڑھ کر اب تک کوئی کتاب نہیں۔ ڈاکٹر صاحب کے بے حد پھیلے ہوئے کام کو سمیٹنا بھی ایک کمال ہے۔ طاہر تونسوی نے اسے سمیٹ کر پھر پھیلا دیا ہے اس نے صحیح معنوں میں حق ادا کردیا ہے۔ مختلف ابواب کے نام پڑھ کر جو لہر سی محسوس ہوتی ہے وہ مطالعے کے دوران فوطان بنتی چلی جاتی ہے۔''لفظوں کی مالا'' بگولوں کا اضطراب'' باطن کی تاریکیوں میں روشنی کا متلاشی''نفسیات اور جنس کے تنے رسے پر''بدیسی خوشبو کا اردو ادب'' وگیرہ ان عنوانات میں ایک تخلیقی جوش ہے مگر مضامین میں تحقیقی ہوش کا رویہ غالب ہے کتاب میں بہت کم متنازعہ معاملات کو چھیڑا گیا ہے اس سے کتاب کی اہمیت میں نہ کچھ اضافہ ہوا ہے اور نہ کمی ہوئی ہے۔ میرے خیال میں اس کتاب کو جھیڑے جھگڑے سے پاک رکھنے کی کوشش بہرحال نظر آتی ہے۔ یہ معاملات اب چونکہ ڈاکٹر سلیم اختر اور ڈاکٹر طاہر تونسوی کی زندگی کا حصہ بن چکے ہیں لہٰذا انہیں درمیان میں لائے بغیر شاید چارہ نہ ہو۔ اس کتاب میں بہرحال کوئی ایسا ارادہ خاص طور پر کھل کر ظاہر نہیں ہوتا۔ اس طرح کے کاموں کے لیے طاہر کے لیے مواقع پیدا کرلینا کوئی مشکل نہیں۔ کچھ مواقع دوسرے لوگ بھی فراہم کردیتے ہیں شاید طاہر نے سمجھا ہو کہ اس کے بغیر ڈاکٹر سلیم اختر پر کیا گیا کام ادھورا نہ رہ جائے۔ اس حوالے سے اس نے تکمیل کردی ہے۔ مکمل ہونے کا احساس اس لیے بھی ہے کہ اب ڈاکٹر اختر جو کام کریں گے۔ ان دائروں سے باہر نہ نکلیں گے۔ دائرہ بڑھا لینا اور بات ہے۔ طاہر نے ڈاکٹر سلیم اختر کی شخصیت اور فن تک پہنچنے کے لیے کئی دروازے بنادیئے ہیں جس دروازے سے کسی کا جی چاہے آئے باہر جانے کے لیے بھی یہی دروازے استعمال ہوسکتے ہیں میرا خیال ہے کہ اب تک جو کچھ ڈاکٹر سلیم اختر نے لکھا اور ان کے بارے میں کسی نے کہیں کچھ لکھا ہے۔ اس سبب کا حوالہ طاہر کی اس کتاب میں موجود ہے۔ تحقیق نقطہ نظر سے یہ بات اس کی محنت اور مہارت کی گواہ ہے تقریباً تمام تحریوں سے کوئی نہ کوئی اقتباس کتاب میں شامل ہے۔ پروفیسر ڈاکٹر اے بی اشرف کی یہ رائے اپنے اندر ایک عمومیت رکھتی ہے۔

''ڈاکٹر سلیم اختر نقاد بھی ہیں افسانہ نگار بھی محقق بھی اور مورخ بھی اور سب سے بڑھ کر ادبی معرکہ آرا بھی ان کے ادبی اکھاڑے کا سب سے بڑا پہلوان طاہر تونسوی ہے۔''

اس کتاب کے ذریعے نہ صرف آدمی زیر بحث شخصیت سے متعارف ہوتا ہے بلکہ اس کا دوست بنتا ہے۔ دو طرح کے آدمی دلکشی کے خاص مقام پر ہوتے ہیں۔ ایک وہ جسے آدمی نہیں جانتا ہوں اور دوسرا جسے بہت جانتا ہو۔ یہ کتاب ڈاکٹر سلیم اختر کو پوری طرح جاننے کی توفیق فراہم کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ نفسیاتی حوالے سے جنسی مسائل پر ڈاکٹر صاحب بڑی روانی اور آسانی سے بات کرتے ہیں۔ ان کا اپنا کیا حال ہے طاہر تونسوی کی زبانی سنیے۔

''ڈاکٹر سلیم اختر بہت ہی شرمیلے واقع ہوئے ہیں اگرچہ وہ جنس کے بارے میں بہت پڑھتے اور لکھتے ہیں مگر جنس کے بارے میں گفتگو سن کر یا کوئی مزیدار جنسی لطیفہ سن کر شرمانے لگتے ہیں۔ یہی حال ان کا صف نازک کے بارے میں بھی ہے ایسا لگتا ہے کہ وہ حسن کی اداؤں کو محسوس تو کر سکتے ہیں مگر دیکھ نہیں سکتے۔ خدا معلوم حوران خلد کا سامنا کس طرح کریں گے۔

اگر کوئی قتالہ ان کے پاس گھنٹوں میں بھی بیٹھی رہے تو وہ اس سے بھی بہت کم بات کریں گے بلکہ اس طرف متوجہ ہی نہیں ہوں گے۔ یہ جو میں نے لکھا ہے کہ متوجہ ہی نہیں ہوں گے تو اس میں کوئی مبالغہ نہیں۔ میں متعدد واقعات میں سے ایک واقعہ سناتا ہوں۔ میں جن دنوں گورنمنٹ کالج لاہور میں تھا تو ایک طرحدار خاتون مجھ سے ملنے آئیں۔ میں تو تھا نہیں۔ ڈاکٹر صاحب کمرے میں تھے انہوں نے بتایا کہ طاہر تونسوی تو موجود نہیں۔ آپ انتظار کرنا چاہیں تو بیٹھ جائیں۔ وہ بیٹھ گئی۔ ڈاکٹر صاحب اپنا مقالہ لکھتے رہے وہ کوئی دو گھنٹے بیٹھی بور ہوتی رہی۔ اور انہوں نے ایک لمحہ کو بھی سر اٹھا کے اس کے سراپا رنگ اور کپڑوں کو نہ دیکھا میں آیا تو اس نے سب سے پہلے مجھ سے نہایت جلے کٹے لہجہ میں کہا۔ عجیب انسان ہے سارا وقت بیٹھا لکھتا رہا۔ میں نے بات کی تو لاپرواہی سے بولے۔ دراصل میں نے ایک تقریب میں مقالہ پڑھنا ہے اور وہ میرے اعصاب پر سوار ہے چلیے کم از کم ایک ادیب تو ایسا ہے جس کے اعصاب پر عورت کی بجائے ادب سوار رہتا ہے۔''

طاہر تونسوی نے اس واقعے کا نفسیاتی تجزیہ نہیں کیا۔ یہاں ڈاکٹر انوار احمد کی بات محل نظر ہے۔ ''وہ ایک مشفق استاد محنتی ادیب اور انتھک شوہر ہیں۔'' اس سلسلے میں ڈاکٹر سلیم اختر کے رائے بیان کرتا ہوں جو اسی کتاب میں موجود ہے۔

''آج کا ادیب تو بالکل عشق سے بیگانہ ہو کر رہ گیا ہے۔ اسے اب غم عشق سے زیادہ غم انسان پیارا ہے۔ غم محبوب پر وہ غم زیست کو ترجیح دیتا ہے۔ اب وہ اتنا بزدل نہیں رہا کہ محبوب کی ناراضگی سے اس کے دل کی دنیا تہ و بالا ہو جائے۔ اس کے معاشی تقاضے جنسی جذبات سے زیادہ اہم ہیں اور اسی لیے اب محبوب کا پیکر اور صفات بالکل تبدیل ہو چکی ہیں۔''

طاہر تونسوی کا رویہ اس کتاب میں دوستانہ بلکہ کسی حد تک عقیدت مندانہ ہے یہ کتاب ’’مدلل مداحی سے‘‘ کچھ بڑھ کر ہے کہ طاہر تونسوی کا ممدوح تاریخ ادب اردو کی ایک اہم اور ممتاز شخصیت ہے طاہر تونسوی نے تعریف اور تجزیے کو باہم آمیخت کر کے اپنی بات کی ہے وہ ادب سے ڈاکٹر صاحب کے پیچھے چلتا ہے۔ کبھی ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر ساتھ ہو لیتا ہے کبھی ایک خاص ادا سے آگے بھی نکل جاتا ہے۔ شاید اس لیے کہ ڈاکٹر صاحب کو سامنے سے دیکھ سکے۔ البتہ یہ بات اچھی لگی کہ وہ خود اس کتاب میں سامنے نظر آتا ہے۔ ورنہ شخصیات پر لکھی ہوئی تحریروں میں زیر موضوع آدمی لکھنے والے کے سائے میں گم ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر کو شفاف آئینوں کی روشنی میں لے آیا گیا ہے۔ اب تو انہیں اندھیرے میں بھی پہچان لینے میں دشواری نہیں ہوگی۔

◆◆◆

خاکہ نگاری کا انڈیا گیٹ

بعض اقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی کے بارے میں لکھے ہوئے چند فقرے اتنے توانا اور جاوداں ہوتے ہیں کہ دونوں کو زندہ رکھتے ہیں میں نے ایسا ایسا خاکہ بھی پڑھا ہے کہ جس میں ایک وجود کی مٹھی بھر خاک اپنا خمیر اور ضمیر منکشف کرتی ہے کہ وابستگی ہیشگی بن جاتی ہے۔ زمین اور زمانہ ایک ہی دائرے کا مرکز بن جاتے ہیں۔ منٹو نے ''گنجے فرشتے'' یمن قائداعظم کا خاکہ لکھا ہے۔ میرا صاحب میں نے قائداعظم کے بارے میں جو دو چار چیزیں پڑھی ہیں بڑے اعتماد کہہ سکتا ہوں کہ ان سب میں سے منٹو کا خاکہ سب سےقیمتی موثر اور خوبصورت تحریر ہے۔ اس خاکے سے مجھ پہ کھلا صاحب کردار شخص صاحب دل بھی تھا عقیدت سے زیادہ محبت کے قابل تھا میرے خیال میں محبت بہر حال عقیدت سے بڑا جذبہ ہے۔

اصل میں منٹو کسی کردار کے بارے میں اس توقع سے لکھتا تھا کہ اس ہستی میں ضرور کوئی ایسی معنویت ہے جس کی دوسروں کو سمجھ نہیں آتی۔ عصمت چغتائی کا خاکہ ''دوزخی'' پڑھ کر ذرا سی دیر کے لیے جنت کی خواہش ختم ہو جاتی ہے۔ مرزا فرحت اللہ بیگ نے اپنے استاد خشک مولوی نذیر احمد کی دلاویزیوں سے پردہ اٹھایا۔

زیادہ تر ادیبوں نے دوستوں اور دوست ادیبوں کے خاکے لکھے ہیں۔ اس طرح یہ موقعہ ملتا ہے کہ شخصیت کے مکمل تعارف سے اس کے فن کی تفہیم بھی آسان ہوتی ہے مجتبیٰ حسین نے بھی یہی کیا ہے۔ اس کی کتاب ''آدمی نامہ'' میں پندرہ خاکے شامل ہیں جو سب کے سب اس کے دوست ادیبوں کے بارے میں ہیں۔ جتنا گہرا دوست ہوگا اتنا ہی زبردست خاکہ لکھا جائے گا۔ مذاق سہنا دوستوں کا ہی کام ہے۔ ورنہ ذرا ذرا سی بات پر بندے قتل ہو جاتے ہیں۔ دوستوں کی محفل میں یا ک دوسرے سے ہنسی مذاق خلوص و محبت کی دلیل ہوتا ہے مجتبیٰ نے محبت اور خلوص سے بہت مدد لی ہے معروف اور محبوب لکھنے والوں کا خاکہ لکھنا آسان ہوتا ہے مگر اس میں پڑتی ہے محنت زیادہ خاکہ نہ قصیدہ ہے نہ ہجو ہے یہ ایک بے تکلف آشنا اور راز دار قسم کی تحریر ہے۔ یہ ایک عمارت کا کھلا دروازہ ہے مگر اس میں کئی چور دروازے بھی ہیں جن میں جھانک کر دیکھنا بہت مشکل ہے کیونکہ بظاہر یہ ہوتے ہی نہیں بنانے پڑتے ہیں دلی میں واقع وسیع و عریض رقبے پر پھیلی ہوئی تفریح گاہ میں موجود انڈیا گیٹ دیکھا جائے تو آدمی کچھ پریشان ہوتا ہے کہ یہاں دروازے کی ضرورت کیا تھی۔ مگر اس کے جمال کو دیکھ کر پریشانی ایک حیرانی میں بدل جاتی ہے۔ اس دروازے سے گزرنے کا احساس ہوتا ہے مگر

آپ کہیں اور نہیں جاتے۔ مجتبیٰ کے خاکے پڑھنے کے بعد آدمی سوچتا ہے کہ اس میں خاص بات کیا ہے۔

کسی چیز کے لیے یہ سوچ ہی اسے خاص بناتی ہے مجتبیٰ مذکورہ آدمی ہے ہمارا تعارف نہیں کراتا اسے ہمارا دوست بنا دیا ہے ہمیں نہ صرف اس کا قرب حاصل ہوتا ہے ہم اس کے کرب کو بھی محسوس کرنے لگتے ہیں۔ کچھ باتیں کسی کے بارے میں نہیں بتانے والی بھی ہوتی ہیں۔ مگر مجتبیٰ ایسا نہیں کرتا اچھا کرتا ہے۔ اسی لیے تو اس نے بہت اچھے خاکے لکھے ہیں۔ کئی ادیبوں کے خاکوں میں کسی سراپے پر خاک بھی اڑتی محسوس نہیں ہوتی۔ ایک بیرنگ دھول لفظوں کے آس پاس آوارہ پھرتی رہتی ہے۔ خاکہ کسی شخصیت کا آئینہ ہوتا ہے۔ جہاں عکس در عکس اس کی صفات کمالات اور تضادات منظروں کی طرح جمع ہوتے چلے جاتے ہیں۔ جو کئی سمتوں سے پڑھنے والوں کے سامنے ہوتے ہیں عکس کے برعکس دنیا بھی اوجھل نہیں ہونے پاتی۔ ہوا جب کسی درخت میں سے گزرتی ہے تو سارے پتے کھڑ کھڑ بولنے لگتے ہیں۔ خاکہ نگار کا یہ بھی کام ہے کہ سوئی ہوئی آوازوں اور کھوئے ہوئے رازوں کے انبار لگا دے کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو خاکہ نگار خبریں نہیں سناتا خبروں کے لیے ماحول بناتا ہے۔

ہر آدمی کے لیے خاکہ مختلف رنگ روپ اور ذائقے کا ہونا چاہیے۔ ہر آدمی ایک اور آدمی ہوتا ہے۔ صرف چہرے مہرے سے نہیں دل و دماغ کے اندر بھی خاکہ نگار تو اندر اور باہر سے ایسا آدمی تلاش کر لاتا ہے جس سے مل کر آدمی خود سوچ میں پڑ جاتا ہے کہ اچھا یہ میں ہوں۔ اور وہ اس سے انکار بھی نہیں کر سکتا۔ ایک کمال بات ہے مجتبیٰ کے خاکوں میں کہ وہ اپنے ''مخلوک'' میں کوئی نہ کوئی مزاحیہ خصلت نکال لیتے ہیں۔ باطن کے علاوہ ظاہر بھی مختلف طرح ظاہر ہوتا ہے۔ اصل کا میہ ہے کہ آدمی کے اندر کو باہر لایا جائے۔ اسے کھینچ کھانچ کے باہر لانا نقادوں کا کام ہے۔ بہلا پھسلا کر باہر بلا کے لانا خاکہ نگار کا وصف ہے۔ ممتاز مفتی نے اپنی کتاب ''اوکھے لوگ'' میں ادیب دوستوں سے اسی طرح کی چال چلی ہے۔ مجتبیٰ کی اس چال کو ڈاکہ بھی کہا جا سکتا ہے حضرت علی نے کہا تھا کہ کائنات عالم اکبر ہے اور ہر انسان عالم اصغر ہے ممتاز مفتی نے اپنے خاکوں حضرت علی کے اس قول کی تائید کی ہے۔ مگر اس نے کچھ لوگوں کے عالم اصغر کو عالم اکبر بنا دیا ہے۔ مجتبیٰ نے لوگوں کو ان کے اپنے جہان میں لا کھڑا کیا ہے۔

جو لوگ ممتاز مفتی کے عنوانات بنے ہیں کچھ صوفی ہیں کچھ پر اسرار ہیں۔ ان کے اپنے جیسے ہیں مجتبیٰ نے ہر طرح کے دوستوں کو موضوع بنایا ہے۔ ایک آدمی جوان دونوں کے ہتھے چڑھا ہے وہ فکر تونسوی ہے۔ ممتاز نے اسے ''پیاز کا چھلکا'' اور مجتبیٰ نے ''بھیڑ کا آدمی'' کہا ہے۔ ان دونوں خاکوں میں فرق صرف اتنا ہے۔ کہ ممتاز نے لاہور والے فکر کا خاکہ لکھا ہے اور مجتبیٰ نے دلی والے کا آدمی پر ہوتا ہے اثر شہروں کا ورنہ شہروں پر آدمی کا اثر چڑھ جاتا ہے یہ دیکھنے کے لیے یہ دونوں خاکے پڑھنے پڑیں گے۔

محمد طفیل نے بھی زیادہ تر دوست ادیبوں کے خاکے لکھے ہیں ان میں ان کے افسر دوست بھی شامل ہیں۔ نجانے کیوں ہمیں دوست کے افسر ہونے اور افسر کے دوست ہونے پر اعتراض ہی رہتا ہے۔ دوست تو جائیداد ہوتے ہیں رشید احمد صدیقی نے خاکوں کی اپنی کتاب کا نام ''گنج ہائے گرانمایہ'' رکھا ہے۔

بعض ادیب ایسے بھی ہیں جنھوں نے ایک ایک خاکہ لکھ رکھا ہے۔ مگر اس رستے پر جاتے ہوئے آپ ان تحریروں کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔ یہ بھی ہے کہ بہت سے خاکوں میں سے ایک آدھ ہی زندہ بچا۔ کچھ لوگوں کو دوسری تحریری ایسی ہیں کہ جن میں سے کئی پر خاکے کا گمان ہوتا ہے ییٹس نے اپنی کتاب ''اے ویژن'' کے دیباچے کا نام ''اے پیکٹ فار ایذرا پاؤنڈ'' رکھا ہے یہ مضمون خاکہ بلکہ تحفہ ہے۔ میکسم گورگی نے چیخوف کے لیے جو تحریر لکھی ہے بہت خوبصورت رابطوں کی کہانی ہے۔ سہیل احمد خان نے ''درخت کی حقیقت'' کے نام سے شاکر علی کے لیے ایسی ہی تحریر لکھی ہے۔ ایک آدمی کے اندر بھی ان گنت آدمی ہیں مگر بعض ادیبوں کے خاکے پڑھ کر لگتا ہے جیسے سب شخصیتوں پر ایک ہی چہرہ سجا ہوا ہو۔ اگر خاکوں پر نام نہ لکھا ہو تو خاصی الجھن ہو۔ ایک ٹھہری ہوئی دنیا جس میں سب لوگ ایک جیسے اس حمام میں سب ننگے جو ننگے نہیں ان کے کپڑے اتروا لیے گئے ہیں چہرہ نمائی پر زور زیادہ ہوتا ہے۔ آنکھیں کیسی ہیں مونچھیں کتنی بڑی ہیں چال بے ڈھنگی ہے کہ نہیں اور بس خاکے نیم تاریک کمرے میں بے جان لفظوں کے ساتھ لٹکی ہوئی تصویریں بن جاتے ہیں تصویریں الٹی ہی لٹکی ہوئی ہوتیں تو بھی بات بن پاتی۔ یہ لوگ تو درد اور نشاط کے معمولی تاثر سے بھی عاری کر دیئے جاتے ہیں۔ خاکہ آئینے کے علاوہ ایسا شفاف ہوتا ہے جس کے آر پار دنیائیں اور زندگیاں صاف نظر آتی ہیں جس کا خاکہ لکھا گیا ہے اس کو بھی سب کچھ نظر آتا ہے اپنے لکھے ہوئے خاکوں میں مجتبیٰ بھی نظر آتا ہے اور اچھا لگتا ہے بلکہ دوست اچھا لگتا ہے بلکہ دوست لگتا ہے مجتبیٰ نے خاکوں میں دوستی لکھی ہے اس کی تحریروں میں وہ نہ زینہ ننھی سی چمک دکھا کر گم نہیں ہو جاتا جس کے ذریعے ایک دوسرے تک پہنچا جا سکتا ہے۔

مجتبیٰ کا خاکہ حقیقتی میں مزاحیہ ہوتا ہے۔ خاکہ مزاح کے بغیر ایسا ہی ہے جیسے انشائیہ انشائیے والے مزاح سے چڑتے ہیں۔ مجتبیٰ اپنی منتخب کردہ شخصیت سے چھیڑ چھاڑ کی اجازت دیتا ہے۔ کبھی سنجیدہ بھی ہوتا ہے۔ مگر اندر ہی اندر ایسی فضا بناتا رہتا ہے کہ اچانک پھلجڑی سی چھوٹ جاتی ہے پھلجڑی میں چنگاری بھی ہوتی ہے مگر یہ جلاتی نہیں مجتبیٰ کی تحریروں میں کوئی بات شخص مذکور کو بری بھی لگے تو وہ برا نہیں مناتا۔ میرے خیال میں اس نے مزاح نگاری اور خاکہ نگاری میں کوئی دیوار کھڑی نہیں کی۔ اس کے مزاحیہ مضامین کی کتاب ''بالآخر'' میں ایک مضمون کا عنوان ہے۔ ''اردو کا آخری قاری۔'' بھارت میں اردو والوں کی پریشاں حالی کا اس سے موثر

اظہار نہیں ہوسکتا۔ یوں لگتا ہے جیسے بھارت میں اردو کا آخری قاری خود مجتبیٰ حسین ہے۔ اردو کے لیے کچھ مایوس ہے مگر اس سلسلے میں مستعد زیادہ ہے۔ مذاق مذاق میں اس نے اردو کے لیے بلند بانگ دعووں والوں کی قلعی کھول دی ہے۔ بھارت میں اردو تحریروں کے لیے قاری تلاش کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔ دلی میں اردو کا مجتبیٰ جیسا عاشق کم کم دیکھا۔ اس کی مزاح نگاری اور خاکہ نگاری اردو کے قارئین کو اٹریکٹ کرنے کا ایک بہانہ ہے۔ یہ ایک جہاد بھی ہے مجتبیٰ اردو اور مزاح کے مخلصوں کے لیے امداد باہمی کا دفتر ہے جو چھٹی کے دن بھی کھلا رہتا ہے۔

خاکہ مزاح کا چچازاد بھائی ہے خاکے کا کامیابی یہ بھی ہے کہ جس کے بارے میں لکھا جائے وہ خود ہنس ہنس کے نڈھال ہوجائے۔ یہ تحریر اکیلے میں پڑھے تو ایک بے اختیاری اس کو مسلسل گدگداتی رہے۔ کسی لکھنے والے کا کمال یہ ہے کہ دوست خواہش کریں کہ ان کے بارے میں خاکہ لکھا جائے مجتبیٰ نے خود لکھا ہے کہ کئی لوگوں نے ایسی فرمائش بھی کر چھوڑی ان کو معلوم نہیں شاید کہ خاکہ اور سہرہ دو مختلف تخلیقات ہوتی ہیں خاکے کی ایک صفت یہ ہے کہ کسی کے خلاف یا حق میں نہیں ہوتا۔ اگر کسی طرح تو اس کی کی تحریر کوئی اور شے بن جاتی ہے۔

مجتبیٰ ''آدمی نامہ'' کے دیباچے میں لکھتا ہے۔''

''جن اصحاب کے خاکے اس مجموعے میں شامل ہیں ان میں سے دو تین کے بارے میں مجھے خفیہ اطلاعیں مل چکی ہیں کہ اب بھی چوری چھپے دوسروں سے استفسار کرتے رہتے ہیں کہ یہ خاکے ان کے خلاف ہیں یا ان کے حق میں ہیں؟''

مجتبیٰ نے کنہیا لعل کپور کا خاکہ ''لمبا آدمی'' لکھا ہے یہ ایک نہ بھولنے والی تحریر ہے اس ضمن میں کپور صاحب کی اپنی رائے بھی لاجواب ہے۔

''تم نے اس خاکسار کا جو خاکہ لکھا ہے وہ اتنا دلاویز ہے کہ تمہارے قلم کی بلائیں لینے کو جی چاہنے لگا ہے۔ اسے پڑھ کر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں ایک قدم آدم آئینے کے سامنے کھڑا ہوں بے اختیار منہ سے نکلا۔

تو نے کیا یہ غضب کیا مجھ کو ہی فاش کر دیا
میں ہی تو ایک راز تھا سینہ کائنات میں

خاکہ نگاری میں تمہیں واقعی کمال حاصل ہے۔ خدا کرے تمہارا تخیل ہمیشہ جواں رہے۔''

مجتبیٰ کے پندرہ خاکوں کے عنوانات میں ہر ایک خاکے کے ساتھ آدمی کا لفظ شامل ہے کرشن چندر کے خاکے کا نام ''آدمی ہی

آدمی'' محمور سعیدی کا ''بحیثیت مجموعی آدمی'' اور بانی کا ''نو آدمیوں کا آدمی'' ہے مجتبیٰ نے نظیر اکبر آبادی کی زندہ جاوید نظم ''آدمی نامہ'' کو مزید زندہ کر دیا ہے۔ اس نے راجندر سنگھ بیدی کا جو خاکہ لکھا ہے اس کا نام بھی ''مو ہے وہ بھی آدمی'' ہے ہمارے خیال میں نظیر اکبر آبادی کی نظم بھی حضرت آدم کا خاکہ ہی ہے اور یہ ایک مکمل خاکہ ہے آج بھی آدمیوں کی حالت اور قسمت وہی ہے۔ جو نظیر نے بیان کر دی ہے ہمارے ایک ادیب گلزار وفا چوہدری نے روزنامہ نوائے وقت لاہور میں اپنے عہد کے ادیبوں کے خاکوں کا ایک سلسلہ ''سو ہے یہ بھی آدمی'' کے نام سے شروع کیا تھا۔ یہ نام خاکہ نگاروں کی کشش ثقل سے نکلا نہیں۔گلزار نے بہت مزیدار خاکے لکھے۔ اس کے بعد کی نسل سے محمد یونس بٹ اور اعجاز رضوی نے بھی کچھ خوبصورت خاکے لکھے ہیں۔ ان دونوں کی زیر طبع کتاوں کے نام ''شناخت پریڈ'' اور ''کلوز اپ'' خاکہ نگاری کے جدید اسلوب کی طرف اشارہ کرتے ہیں ان خاکوں میں جملہ بازی کو کردار سازی کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔

دوستوں کے خاکے لکھتے ہوئے مجتبیٰ کبھی کبھی اپنا خاکہ لکھ جاتا ہے شاید وہ اپنا خاکہ لکھنے کی خواہش میں مبتلا ہے۔ بالعموم خاکہ نگار اپنی ذات کو دور نہیں ہٹا سکتا۔ وہ دوسروں کو ان کے گھر تک پہنچانے کے شوق میں اپنے دروازے کھولتا چلا جاتا ہے۔فرق یہ ہے کہ خود کو منکشف کرتا ہے دوسروں کو افشا کرتا ہے۔

کسی ایک آدمی کہ بھی کئی لوگوں کا خاکہ ہو سکتا ہے اس ہجوم میں خاکہ نگر بھی چپکے سے چھپ کر شامل ہو جاتا ہے۔ آپ بیتی خاکہ ہی ہوتا ہے پروفیسر جگن ناتھ آزاد خاکوں کی اپنی کتاب ''آنکھیں ترستیاں ہیں'' کے حرف اول میں کہتے ہیں۔

''یہ مختصر سی کتاب میری یادوں کی داستان کا ایک ورق ہے۔ بلکہ اگر میں یہ کہوں کہ یہ میری داستان حیات کا ایک ورق ہے تو غلط نہ ہوگا۔ اس داستان میں جن شخصیتوں کا ذکر آیا ہے ان کے ساتھ میرا تعلق خاطر ایک سا نہ تھا۔ لیکن ان سب نے میری زندگی کو کسی نہ کسی طرح متاثر ضرور کیا ہے۔''

جگن صاحب کرشن چندر کے لیے لکھے گئے خاکے کے بارے میں کہتے ہیں۔

''اس مجموعے کا مقالہ ''کرشن چندر کی یاد میں'' دراصل مقالہ نہیں بلکہ میری زیر تکمیل سوانح حیات کے اقتباسات پر مشتمل ایک تحریر ہے۔''

جگن صاحب نے خود ہی مقالہ اور خاکہ میں فرق کم سے کم کر دیا ہے۔ میرے خیال میں تنقیدی مضمون بھی کچھ نہ کچھ خاکہ ضرور ہوتا ہے۔ کسی آدمی کی شخصیت کو قریب سے دیکھے بغیر اس کے فن کو کیسے سمجھا جا سکتا ہے۔ جگن صاحب کی ایسی تحریروں میں مزاج بہت

کم ہے۔اسی لیے انہیں ان پر مقالے کا گماں ہوا۔دراصل یہ مرحوم دوستوں کی یادوں کا مرقع ہے جن میں ملال کا رنگ غالب ہے مگر ملال کبھی جمال سے خالی نہیں ہوتا۔مجتبیٰ نے خاکوں میں اپنے رابطوں کا خلاصہ لکھا ہے۔وہ اپنے اوپر بھی قہقہہ لگانے سے نہیں چوکتا۔ دوسرا حیرت میں پڑ جاتا ہے کہ یہ میں ہوں تو وہ کون ہے۔ یہ خوشگوار حیرت کا تجربہ ہوتا ہے۔آدمی خوبیوں اور خامیوں کا اشتہار ہے۔وہ ان کی نمائش کرنا چاہتا ہے کہ اس کا نام نہ آئے۔مجتبیٰ نے اسکی یہ مشکل حل کر دی ہے۔

مجتبیٰ کا تعلق حیدرآباد دکن ہے حیدرآباد بھارت میں طنزومزاح کا مرکز بن گیا ہے۔ یہاں ہر سال طنزومزاح کی کانفرنس ہوتی ہے۔اس کی حیثیت بین الاقوامی ہوتی جا رہی ہے اس کانفرنس میں بھارت کے علاوہ پاکستان' امریکہ' روس' برطانیہ نیپال اور کئی دوسرے ملکوں سے مندوبین شرکت کرتے ہیں یہاں پڑے جانے والے فن پارے خوشیوں اور خوش فہموں کے مشترکہ اعلامیہ کا درجہ رکھتے ہیں۔مجتبیٰ اس ساری سرگرمی کا اصل آسمان ہے وہ چاہتا ہے کہ اردو زندہ رہے قہقہوں کی آکسیجن کے سہارے ہی زندہ رہے آنسو اردو زبان وادب کے پاس بہت ہیں۔رونے سے آدمی اپنے اندر سے بہت کچھ حاصل کر سکتا ہے۔باہر سے کچھ حاصل کر پاتا۔ یہ کانفرس حیدرآبادیوں کے لیے تہذیبی تہوار بن گیا ہے۔حیدرآباد کے عروج وزوال کی یاد نے یہاں کے لوگوں میں حس مزاح کو بیدار کر دیا ہے۔یہ ایک زندہ شہر ہے جو بربادیوں کی بکھرتی ہوئی دھول سے نمودار ہو رہا ہے۔شہر بھی ہوتے ہیں تاریخ بنانے والے کانفرس میں مزاحیہ مضامین' نظمیں خاکے اور لطیفے پڑھ کر سنائے جاتے ہیں لطیفہ بھی ایک چھوٹا خاکہ ہوتا ہے۔ پاکستان میں سکھوں کے لطیفے مشہور ہیں۔ بھارت میں یہی لطیفے پاکستان مسلمانوں کے حوالے سے سنائے جاتے ہیں۔ بھارت کے مسلمان کسی ہنسی کا عنوان بھی نہیں بن سکتے۔

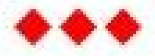
حیدرآباد کے ہر ادیب اور شاعر نے فرض سمجھا ہوا ہے کہ وہ مزاح بھی لکھے۔ ہر اچھے ادیب میں تھوڑا سا مزاح نگار ہوتا ہے۔ مزاح نگار ہوتا ہے تو تھوڑا سا خاکہ نگار بھی ہوتا ہے۔میرے خیال میں ہر ادیب کو ایک آدھ خاکہ تو ضرور دیکھنا چاہیے۔ ورنہ اس کی تحریروں میں خاکے کا سراغ لگایا جا سکتا ہے۔غالب کے خطوط پر خاکوں کا شک گزرتا ہے غزل کبھی عاشق کبھی محبوب کا خاکہ بنتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ ہر صنف سخن میں دوسری اصناف کی نشانیاں موجود ہوتی ہیں۔مجتبیٰ کے بہت سے خاکوں میں حیدرآباد کہیں کہیں دکھائی دیتا ہے۔

حیدرآباد دکن کی طرح حیدرآباد سندھ میں بھی طنزومزاح کی کانفرنس عطاالحق قاسمی کے بھائی ضیاءالحق قاسمی کی کوششوں سے منعقد ہوئی ہے۔عطا اور ضیا حیدرآباد دکن جا چکے ہیں عطا نے کالم نگاری اور مزاح نگاری کو یکجان کر کے پورا ادب بنا دیا ہے۔اس نے

بہت ہی دوست ندار خاکے بھی لکھے ہیں عطا سمجھتا ہے کہ مجتبیٰ بھارت کا بہت بڑا مزاح نگار ہے ہیں سمجھتا ہوں کہ مجتبیٰ بھارت کا بہت بڑا خاکہ نگار ہے ویسے بات ایک ہی ہے۔

مجتبیٰ نے سفرنامے بھی لکھے ہیں۔ ان سفرناموں میں ان لوگوں کا احوال زیادہ ہے جو اسے بر سبیل سفر ملے تھے۔ اس تذکرے میں خاکے کے در آنا فطری امر ہے۔ سفرنامے میں مجتبیٰ ابن انشا کا عزیز لگتا ہے۔ یوں وہ ابراہیم جلیس کا بھائی ہے۔ یہ دونوں مزاح نگار بھی ہیں۔ ''چلتے ہیں تو چین کو چلیے'' ابن انشاء کے ایک سفرنامے کا نام ہے۔'' جاپان چلو جاپان چلو'' مجتبیٰ کے ایک سفرنامے کا نام ہے۔ کشادگی آوارگی اور آمادگی جو سیاح کی فطرت میں بھری ہوتی ہے۔ سفرنامے کو مزاح کی چاشنی اور چاندنی سے نکھار دیتی ہے۔ کسی پرانے کا قول ہے کہ انسان کی اصلیت کا پتہ دوران سفر چلتا ہے۔ سفر میں آدمی اپنوں کے درمیان نہیں ہوتا۔ وہ کسی کام میں عار نہیں محسوس کرتا۔ وہ اپنے آپ کو لپیٹ لپیٹ کر نہیں رکھتا۔ زندگی بھی ایک سفر ہے۔ سفر کرنے والے کی حرکتوں کو بیان کر دیں خاکہ خود بخود بن جائے گا۔ خکاہ کسی منصوبہ بندی کو برداشت نہیں کرتا۔ بے تکلفی اس کی پہلی ادا ہے جب کسی کا خاکہ لکھنے کی اکساہٹ محسوس ہونے لگے تو بات بن جاتی ہے ہم سفر کا خاکہ لکھنا دوبارہ سفر کرنے کی طرح ہے مجتبیٰ کے سفرنامے کو متعلقہ مالک کا خاکہ سمجھ لیں۔ دنیا کے نقشے پر یہ ملک دوست ملک کی طرح نمودار ہوتا ہے۔

خاکہ کسی بھی چیز کا لکھا جا سکتا ہے۔ مخلوک اپنی طرح کی واحد مخلوق ہے۔



بے چراغ بستی کی کہانی

منصور قیصر کے افسانوں کا مطالعہ بے چراغ کی بستی کی سیر جیسا ہے ہم جس زندگی میں بس رہے ہیں۔اس کا نین نقشہ بھی بے چراغ بستی جیسا ہے۔محکمہ مال کے کاغذوں میں بے چراغ بستی کی جو تعریف لکھی گئی ہے ایک علامتی افسانے کی تنقید کی طرح لگتی ہے۔ یہ بستی ہوتی ہے مگر نہیں ہوتی۔ یا پھر نہیں ہوتی مگر ہوتی ہے۔ بے چراغ بستی اور بے حیات زندگی میں کچھ خاص فرق نہیں۔ منصور قیصر ان بستیوں میں روشنی بچانے کے عمل میں مصروف ہے ادھر ادھر کہیں کہیں جگنو کی طرح کوئی آدمی چمکتا ہے۔مگ اس چمک کو فوراً اندھیرا نگل لیتا ہے کبھی کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ ہم جسے روشنی سمجھتے ہیں وہ آگ ہوتی ہے اس کے گرداگرد پروانے اور پھر راکھ۔اور راکھ اڑنے لگتی ہے۔ایسے میں کچھ لوگ اندھیرے میں دیکھنے کے اہل ہو جاتے ہیں۔منصور ان کو پہچاننے میں نہ غلطی کرتا ہے نہ دیر کرتا ہے جو بستی کو بے چراغ کرنے والے ہیں۔ مجھے ناصر کاظمی یاد آتا ہے۔آوارہ گرد دونوں ناصر اور منصور کے مزاجوں میں فرق تھا۔ایک کی اداسی میں خفتہ نشاط کی ادائیں تھیں ایک کی بے باکیوں میں خفیہ فکرمندی کے انداز میں۔

اس شہر بے چراغ میں جائے گی تو کہاں
آ اے شب فراق تجھے گھر ہی لے چلیں

ناصر عمر بھر شب فراق کا میزبان رہا۔ایک وقت آتا ہے کہ میزبان اور مہمان میں فرق نہیں رہتا۔کچھ لوگ شب وصال کے لیے کیا کچھ نہیں کرتے۔تھوڑی سی روشنی پاس ہو تو منصور کی کہانیوں میں وہ لوگ بھی نظر آجاتے ہیں جو شب وصال کے وارث بننے کے لیے سردھڑ کی بازی لگانے پر تلے ہوئے ہیں۔ پڑھنے والوں کو منصور بے چراغ بستی کا مسافر بنانے میں کامیاب ہوتا ہے مگر وہ ان کے لیے مشکلات کے ڈھیر نہیں لگاتا۔اپنا دوست بناتا ہے۔ہمارے ہاں کچھ لکھنے والے ایسے بھی ہیں جو پڑھنے والوں کو اپنا نوکر سمجھتے ہیں نہ کام بھی نکلواتے ہیں اور یہ بھی کہتے ہیں ان بے چاروں کو کیا پتہ؟

افسانوں کی کتاب کا نام ''بے چراغ بستی'' کئی پرتوں کی معنویت سے بھرا ہوا ہے اس سے پہلے ''خدا کی بستی'' اور ''بستی'' کے نام سے ناول شائع ہوتے ہیں منفرد افسانہ نگار ظفر خان نیازی اپنے افسانوں کی کتاب کا نام ''آخری بستی'' رکھنا چاہتا ہے۔یہ اس کے ایک افسانے کا نام بھی ہے۔یہ تینوں نام مجھے بہت فکر انگیز لگے۔خدا کی بستی آخری بستی اور بے چراغ بستی کے تصور ہی سے ایک پورا

ماحول سے سامنے بکھر جاتا ہے۔ انتظار حسین کی ''بستی'' ایک ہجرت کدہ ہے۔ جسے وہ اپنا وطن بنانے پر تیار نہیں انتظار کے لیے یاد ابھی خواب نہیں بن سکی۔ ''بستی'' پڑھ لیں تو ہم جس میں رہ رہے ہیں کسی اور کی بستی محسوس ہونے لگتی ہے۔

بستی بسانا کھیل نہیں ہے بستے بستے بستی ہے

اسے پڑھتے ہوئے آدمی اپنے آپ کو پوری طرح اجڑتا ہوا بھی نہیں پاتا۔ ورنہ بات کچھ بن بھی جاتی۔ عجیب بات یہ ہے کہ ہمیں جن پر بستی اجاڑ کا شک ہوتا ہے وہ خود اجڑے ہوئے ہوتے ہیں اور وہ جو بستی بسانے کا ٹھیکہ لے کر بیٹھ جاتے ہیں صرف اپنا گھر بسانے کی تمنا میں پڑے رہتے ہیں ان کا ارادہ یہ ہوتا ہے۔

گلیاں ہوون سنجیاں تے وچ مرزا یار پھرے

ہمیں یہ سب باتیں پتہ ہیں منصور سے ملنے کے بعد اور معلوم ہو جاتی ہیں اور منصور افسانے اور کالم لکھنے کے علاوہ اور کچھ نہیں کر سکتا۔ اور ہم پڑھنے والے اور کچھ کر نہیں پاتے میں نے اس کے کالموں کا ذکر افسانوں کے ساتھ کر دیا ہے تو میں یہ کہتا چلوں کہ مجھے اس کے کالم زیادہ اچھے لگتے ہیں۔ اس کے کالم ذرا سی کوشش سے افسانے بن سکتے ہیں۔ اور اس کے افسانے اتنی ہی کوشش سے کالم بنائے جا سکتے ہین۔ منصور نے لکھنے ہی کبھی تکلف نہین کیا۔ تردد بھی نہیں کیا۔ میرا خیال ہے کہ اس نے کبھی یہ خیال بھی نہیں کیا ہوگا کہ وہ کیا لکھ رہا ہے۔ بس تخلیقی کرب کا اظہار اس کا مسئلہ ہے ہمیں صرف یہ دیکھنا ہے کہ ڈرامہ' کالم مزاح اور افسانہ پڑھنے والوں کو بغیر کسی پریشانی کے یہ محسوس ہوتا ہے یہ تحریر منصور قیصر کی لکھی ہوئی ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ وہ کامیاب ہو گیا اور اس کے پڑھنے والے بھی ناکام نہیں ہوئے۔ لیکن اس بات کا کیا جائے کہ منصور افسانہ نگار کے طور پر زندہ رہنے کی خواہش رکھتا ہے اور اس کی ہر تحریر میں افسانے کی موجودگی اس کی جیت کا پتہ دیتی ہے۔ ہمارے کچھ لکھنے والوں کی بزعم خویش یہ کوشش ہے کہ وہ افسانہ نگار کی حیثیت سے تیسری دنیا کی سطح پر جانے جائیں۔ یہ تو ہو نہیں سکا البتہ وہ تیسرے درجے کے لکھنے والے کے طور پر مشہور ہو گئے ہیں۔ متعارف پھر بھی نہیں ہوئے متعارف ہونے اور مشہور ہونے میں فرق ہے۔

منصور کہتا ہے کہ میری بدقسمتی ہے کہ '' مجھے زندگی بھر قلم کے ذریعے رزق کمانا پڑا۔'' رزق حلال جس طرح بھی کمایا جائے احسن کام ہے۔ ان لکھنے والوں پر اس کی نظر جاتی ہوگی جو قلم کے ذریعے رزق حرام کے انبار لگائے جا رہے ہیں۔ وہ اپنے اردگرد ہر قسم کے حرام خوروں کو خوب جانتا ہے۔ حرام خوری اور حرام کاری باہم ایک ہو کر اتنی بڑھ گئی ہے کہ منصور بھی بری طرح سمجھتا ہوں کہ اب حرام قانوناً جائز کر دیا جائے تا کہ حرام نہ کھانے والے احساس محرومی سے محفوظ رہیں۔ اب تو حرام کمانے کے اتنے ذرائع تخلیق کر لیے گئے

ہیں کہ یقین ہی نہیں آتا کہ جو رزق حلال کماتا ہے کس طرح کما لیتا ہے منصور قیصر کا کمال یہ ہے کہ اس نے قلم کے ذریعے رزق حلال کمایا ہے۔

اپنی قلمی زندگی میں منصور نے بہت کالم لکھے ہیں۔ دوستوں کو خط بھی کچھ کم نہ لکھے ہوں گے۔ اس کا ہر خط ایک کالم ہی ہوتا ہے جو کبھی افسانے کے پلاٹ کے قریب پہنچ جاتا ہے۔ میری طرف جو اس نے خط لکھے ہیں ان کی تعداد اتنی ہے جو ایک شریف آدمی پوری زندگی میں بھی کسی کو نہیں لکھ پاتا۔ ایک فی البدیہہ اپنائیت ان خطوں کا وصف ہے شاید ہی کوئی آدمی ہو جس نے منصور کو خط لکھا ہو اور اسے اس کا جواب نہ ملا ہو۔ منصور کی طرف سے خط کا جواب اس طرح آتا ہے جس طرح گیند اپنے صحیح نشانے پر لگ کر واپس آتی ہے کہ اسے کیچ کرنے میں بھی ذرا دشواری نہ ہو۔ پاکستان کے ہر رسالے میں منصور کی کوئی نہ کوئی شے شائع ہو چکی ہے۔ وہ کسی کے اس مطالبے کو رد نہیں کرتا۔ میں نے میانوالی کالج سے ''سہیل'' شائع کیا تھا اس پر تبصرہ کرتے ہوئے فریدہ حفیظ نے لکھا کہ اس رسالے کی خوب یہ ہے کہ اس میں بھی منصور کی تحریر موجود ہے۔ منصور نے بے تحاشا لکھا ہے۔ مگر اس طرح نہیں لکھا کہ کوئی تحریر اس کی نہ لگے۔ کچھ لوگ تو لکھتے ہوئے بیگار بھگتاتے ہیں اور ان کی تحریر کسی کی بھی نہیں لگتی۔

منصور کی دوستیاں پورے برصغیر میں کھنڈی ہوئی ہیں۔ اس کے پاس سب سے زیادہ دوستوں کے ''اتے پتے ہیں۔'' ہم اسے ڈائریکٹری کہہ سکتے ہیں۔ ڈکشنری بھی کہہ سکتے ہیں۔ ''پتہ اور اتہ پتہ'' دونوں اسے معلوم ہوتے ہیں۔ وہ گھروں سے بھ گھر ہونے والے دوستوں کی تنہائیوں کا راز دار ہے۔ جگراتوں سے لتھڑی ہوئی محفلوں کا حال بھی جانتا ہے منیر احمد شیخ نے اپنی ایک تحریر میں اس کو ''بھا منصور'' کہا ہے۔ وہ سب کا بھا منصور ہے۔ وہ مذہبی آدمی نہیں ہے مگر ایماندار آدمی ہے۔ میرا یہ دعویٰ ہے کہ اس دور میں ایمانداری سے لکھنے والا شخص کچھ نہ کچھ ہوتا ہے منصور نے اپنے افسانوں میں اپنی تہذیبی گم شدگی کے بعد کے المیے کو محسوس کرانے کی کوشش کی ہے۔ اصل عظمت اپنی ہی ثقافتی اقدار کی خوشبو کے اندر ہے۔ منصور کے ایک افسانے ''دو موریہ پل'' میں ایک بھولی ہوئی معاشرت کے ملال کو یاد بنایا گیا ہے۔ منصور باہمت انسان ہے پھڈے باز بھی ہے اس نے بڑے بڑوں کے خلاف لکھ لکھ کر ان کی نیندیں حرام کر دیں۔ وہ اس حرام کو حلال سمجھتا ہے اسنے اپنے سارے رشتوں سے خود کو باندھ رکھا ہے۔ اب وہ لنگڑا کے چلتا ہے تو جیسے نظر آنے والی ساری بدنصیبیوں کو شکست دے کر آ رہا ہو۔ نظر نہ آنے والے عذاوں سے اب ذرا سا گھبرایا ہوا ہے۔ اب وہ عرصے سے فالج کا مریض ہے مگر رواں بلکہ رواں دواں ہے۔ منصور ایک اڑیل گھوڑا ہے گھوڑے کا کام دشوار گزار راستوں کو روندتے دھواں اڑاتے اور منظر بناتے ہوئے دوڑتے چلے جانا ہے۔ منزل تو گھڑ سوار کی آنکھ میں ہوتی ہے۔ منصور کا مسئلہ یہ ہے کہ شہسوار بھی خود ہے

اور اب اس کی ٹانگیں یہ بوجھ سہارنے سے انکاری ہیں۔ ہم اسے آتا ہوا دیکھتے تھے۔ اس کا ایک افسانہ ''ایک بندھا ہوا گھوڑا'' آپ نے پڑھا ہوگا ایک بار اور پڑھ لیجئے۔'' ڈاکٹر اے بی اشرف نے اپنے ایک مضمون میں منصور قیصر کو آج کا بیدار ضمیر کہا ہے اور کہا ہے۔

''یہ خوف ہماری جسمانی بیچارگیوں کا ہی نہیں نفسیاتی اور ذہنی عوارض کا بھی باعث بن گیا ہے۔ منصور قیصر سے زیادہ کون جانتا ہے کہ جسمانی طور پر مفلوج ہوکر تو جیا جا سکتا ہے نفسیاتی اور ذہنی طور پر مفلوج ہوکر جینا عذاب ہے۔ عذاب ایم منصور قیصر کی چھوٹی چھوٹی کہانیاں زندگی کی کھٹی میٹھی سچائیوں کو چھپائے ہوئے ہیں۔ یہ سچائیاں افراد کے مختلف رویوں سے پھوٹتی ہیں۔ لیکن ان رویوں کا تعین عصر کرتا ہے یوں یہ کہانیاں فرد کی سچائیاں بھی ہیں اور عصر کی سچائیاں بھی۔''

ہمارے ملک میں کسی کے خلاف لکھنا ہی ضرات سمجھا جاتا ہے یہ کام بھی منصور نے ہمت سے کیا ہے مگر اس سے بڑی جرات یہ ہے کہ آدمی کسی کے حق میں جس کا حق بنتا ہو اور لوگ اس کے خلاف لکھنا بہادری سمجھتے ہوں۔ اگرچہ آج کل کے حساب سے کلمہ حق وہ ہے جو کسی کے حق میں ہو۔ یہ بات ہمارعہد زوال کی ایک نشانی ہے۔ مگر جب کسی کے خلاف ہی حق سمجھا جارہا ہو اور لوگ اس ناحق کو سوس کرتے ہوئے اس شخصیت کے حق میں بات کرنے کا ''رسک'' نہ لے رہے ہوں۔ تب پتہ چلتا ہے کہ کون کتنے پانی میں ہے منصور ان ''کالے پانیوں'' سے بھی سرخرو آیا ہے محترمہ ثاقبہ رحیم الدین چونکہ ایک جرنیل کی بیوی ہیں لہٰذا کچھ لوگوں کے نزدیک ان کے حق میں لکھنا ''ادبی حوالے سے) گویا مارشل لا کی حمایت کرنے کے مترادف ہے۔ یہ لوگ چونکہ مارشل لا کے خلاف لکھنے کا خطرہ بھی مول نہیں لے سکتے۔ اس لیے محترمہ ثاقبہ کے بارے میں بات نہ کر کے سمجھتے ہیں کہ انہوں نے اپنی انقلابی ہونے کی شرائط پوری کر دی ہیں۔ وہ کسی ایسے آدمی یا خاتون کے حق میں مبالغہ آمیز باتیں کرگزرتے ہیں جو اپنے دفتر یا نجی محفلوں میں حکومت کی مخالفت میں لطیفے سناتی رہتی ہے۔ منصور قیصر نے سب سے پہلے محترمہ ثاقبہ کے لیے تعریفی باتیں کیں اور یہ باتیں سچی تھیں۔ محترمہ ثاقبہ ایک باوفا خاتون ہیں انہوں نے قبائلی روایت کے لوگوں کے شہر کوئٹہ میں ایک شاندار ادبی تنظیم ''قلم قبیلہ'' کی بنیار رکھی۔ ہمارے ہاں استحصال و استبداد کیخلاف قربانیاں دینے والوں نے بہادریوں کے ڈھیر لگا دیئے ہیں مگر نقلی دلیروں کی بھی کمی نہیں۔ منصور نے جو کام کیا۔ دل سے کیا نہ حکام سے نہ ڈرا نہ عوام سے۔ اس نے ایکسپلائٹ کرنے والوں کو بھی ایکسپوز کیا۔ کسی بڑے آدمی میں چھائی تھی یا کسی بڑے آدمی کا چھوٹا پن تھا۔ اس نے سب کا ذکر دل کھول کر اور قلم کو کھلا چھوڑ کر کیا۔

اب میں اس مضمون میں اس ڈر سے کہکشاں فلک ذکر نہ کروں کہ وہ منصور کی بیوی ہے تو یہ بھی ایسی ہی زیادتی ہوگی جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے کہکشاں بھابھی نے ایک ناول لکھا ہے۔ ''اک شخص آشنا سا 1985 میں شائع ہوا ہے۔ یہ ناول ہماری سیاسی تاریک

کے ایک ناقابل فراموش اور متنازعہ کردار ذوالفقار علی بھٹو کی زندگی کے ارد گرد گھومتا ہے اس زمانے میں اس موضوع پر ناول لکھا بڑی جی داری کا عمل ہے۔ یہ کس طرح ممکن تھا کہ منصور قیصر کی اشیر باد کے بغیر اس معرکے میں کہکشاں بھابھی سرخرو ہوتیں۔ سیاسی معلامات ومسائل کو ادب کی چار دیواری میں لے آنا۔اس گھر والوں کا مشغلہ ہے اچھا مشغلہ ہے۔اس میں بڑی مشکلات اور خطرات کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہے۔ یہ بھی مشغلہ ہے اچھا مشغلہ شعروادب کو سیاسی حربے کے طور پر استعمال کرنے کا ہنر اور طرح کی ہشیاری ہے سیاسی دنیا کو ادبی رنگ دنیا اور انداز کی ہنر مندی ہے۔ منصور قیصر اس میدان کا مرد ہے کہکشاں بھابھی ہر میدان میں اس کی رفیق حیات ہے۔

میں دیکھ رہا ہوں منصور قیصر کو کہ وہ سیدھا میری طرف آ رہا ہے۔ اور اس نے بیساکھیوں کا سہارہ نہیں لے رکھا۔اس کے ایک طرف اس کے کالم ہیں۔ ایک طرف افسانے ہیں۔ ساتھ ساتھ کہکشاں ملک بھی چلی آ رہی ہے۔ بے چراغ بستی میں چلنے والوں کے لیے صرف یہی رستہ ہے۔

◆◆◆

دورآباد ادیب کا مقدر

میں نصیر شاہ کو میانوالی کی گمشدہ ادبی متاع سمجھتا ہوں۔انہوں نے خود بھی اپنے آپ کو گم کرنے میں کسر کوئی نہیں چھوڑی۔مگر یہ چیزیں آسانی سے تو گم نہیں ہو جایا کرتیں۔نصیر شاہ اپنے شہر میں کئی سالوں سے اپنے لفظ اور کیال لٹا رہے ہیں اس کے بدلے میں انہیں ملا کیا گمشدگی اور وہ بھی تھوڑی تھوری دیر کی۔میں جب 1975 میں میانوالی کالج پہنچا تو ادبی منظر نامہ ان کی نیم وا آنکھوں سے اوجھل ہو رہا تھا۔انہوں نے اپنے ایک خط میں بھی اس طرف اشارہ کیا ہے۔وہ لکھتے ہیں۔''

''66/ 86 ءتک تقریباً بیس سال میں سپ منظر میں رہا اور لوگوں کے لیے لکھتا پڑھتا رہا اس دوران آپ نے میانوالی آ کر مجھے طویل نیند سے جگایا۔''

نصیر شاہ اردو سرائیکی میانوالی کے ایک بڑے ادیب وشاعر اور دانشور ہیں وہ اپنا ایک زمانہ مکمل کر کے دور کہیں کھڑے تھے جب میں نے میانوالی میں ایک نئی ادبی زندگی کے لیے میدان تیار کرنا شروع کیا۔اس وقت میانوالی کے بے توقیر ادبی ماحول میں خواری کی ایک منزل پر نصیر شاہ مجھے بہت اچھے لگے ہیں میں نے پہلی ملاقات ہی میں بھانپ لیا تھا کہ نصیر شاہ ایک صاحب کمال آدمی ہیں مجھے یوں لگا انہیں دیکھ کر جیسے دریائے سندھ کے کنارے پرویرانیوں اور محرومیوں کا راج ہو اور اس کا پانی جس کا جی چاہے اغوار کر کے لے جائے۔مگر دریاؤں کے پانی کبھی یوں تو ختم نہیں ہوئے۔ان کی کشادگیاں اور گہرائیاں بار بار زندہ ہوتی رہتی ہیں۔

نصیر شاہ نے بہت مطالعہ کر رکھا ہے۔علم وادب کے اس ٹیلے کی مٹی آہستہ آہستہ بکھر کر شادابیوں کا پیام لا رہی ہے۔وہ عربی فارسی انگریزی اردو اور سرائیکی میانوالی پر یکساں عبور رکھتے ہیں۔البتہ وہ اپنے کسی عمومی برتاؤں میں پتہ نہیں چلنے دیتے کہ وہ کوئی پڑھے لکھے انسان ہیں ایک بے پرواہ نشے میں چور ہر شے سے بے نیاز اور بے خبر ان کا چلن دیکھ کر محسوس ہوا جیسے کسی اور کا بدلہ بھی اپنے آپ سے لیے جا رہے ہیں۔قہر درویش بر جان درویش کی عملی تصویر اب شاہ جی کی شخصیت میں پرانی ہوتی جارہی ہے۔میانوالی کے لوگوں کو اب بھی پوری خبر نہیں کہ ان کے درمیان ایک بڑا صاحب علم وادب شخص موجود ہے۔

میں نے میانوالی میں اپنے اپنے باخبر دن سے ہی نصیر شاہ کی تلاش شروع کر دی • اب تک یہ کوشش جاری ہے۔شاہ جی نے بھی اپنا پتہ دینا شروع کر دیا ہے۔منصور آفاق نے بھی اس ضمن میں اپنا کردار ادا کرنا شروع کر دیا ہے۔میں نے ان تینوں فقروں

میں ''شروع کرنے'' کی تکرار اس لیے کی ہے کی میانوالی ادبی لحاظ سے اپنے عروج کے دور میں داخل ہو رہا ہے اب میانوالی کے لکھاریوں کی کتابیں شائع ہونے لگ گئی ہیں۔ اپنی ماں بول میں نصیر شاہ کے افسانوں کی کتاب ''ککر دے پھل'' ابھی شائع ہوئی ہے اور شاہ جی کی عمر پچاس سے وپر ہو چکی ہے۔ انہوں نے جو کچھ بھی لکھا ہے پورے کا پورا کسی کے پاس محفوظ نہیں۔ بہت چیزیں شاہ جی برجستہ اور چانک لکھ کر کہیں رکھ دیتے ہیں یا کسی کو دے دیتے ہیں۔ دونوں صورتوں میں ان کا حشر ایک جیسا ہوتا ہے میانوالی میں امیر کبیر لوگ بھی ہیں۔ یہاں نصیر شاہ کے چولھے کی ٹھنڈی راکھ ان کی آنکھ میں بھی پڑی ہوگی یہ راکھ ان کتابوں کی ہے جن ک نچوڑ شاہ جی نے اپنے لہو میں نچوڑ لیا ہے کتابوں کا اتنا ذخیرہ میانوالی میں تو کسی کے پاس نہ ہوگا۔ مجھے کتب خانے کا ایسا غم نہیں کہ انسانی سینے سے بڑا کتب خانہ اور کیا ہوگا۔ دکھ اس وقت کو ہوتا ہے جب کتابیں جلتی ہیں۔ میانوالی میں کتاب ردی میں تو بکتی نہیں۔ شاہ جی اب کتاب کے دوست نہیں رہے۔ ان کے پاس شاید ایک بھی کتاب اب نہ ہوگی۔ وہ اپنے باہر ادھ موئے ہو کے جینے چلے ہیں اندر سے بھی ان کا دم گھٹ رہا ہے ان کی شاعری اور نثر انہی گھٹی گھٹی سانسوں کی آواز ہے ذوق و شوق کے خزانے لٹانے والا ہے بے سرو سامان ہو کر رہ گیا ہے۔

میں یہاں نصیر شاہ سے لفظ اور خیال خرید کر مہنگا کر کے بیچنے والوں کے نام نہیں بتانا چاہتا۔ مگر ان پر افسوس ہے کہ انہوں نے ایک بیش بہا چیز کوڑیوں کے دام حاصل کی۔ شاہ جی کو بھی جیسے اس شے کی دنیادارنہ قیمت کا اندازہ نہیں۔ اب بھی میانوالی کے کئی لکھاری شاہ جی کے لفظوں کے رزق پر جی رہے ہیں۔ البتہ ایک بات میانوالی کے لوگوں کی ہے کہ انہوں نے ایک رند خراب حال سے نفرت نہیں کی۔ ایک پکے مذہبی ماحول میں رہنے والے بس ان سے غافل ہو گئے ہیں۔ بڑے شہروں کے دانشور صحافی اور عالم ایسے آدمی کے لیے پھانسی کے مطالبے سے بھی گریز نہیں کرتے انہوں نے منصوبہ مقدمے چلوائے لاہور میں اور بہاولپور میں ظہور نظر کا جنازہ تک نہ ہونے دینے سے ایڑی چوٹی کا زور لگایا۔ یہ سب باتیں اس فضا کا نقشہ سامنے لانے کے لیے کر رہا ہوں۔ جہاں نصیر شاہ اپنی حیاتی میں ایک اور حیاتی دیکھنے کی حسرت میں مبتلا رہے یہ حسرت کبھی ان کی خواہش بھی رہی ہوگی۔ خواہش اور حسرت میں اب بھی فاصلہ بھی کیا بچا ہے۔ یہ خواہش کسی زمانے میں علمی و ادبی سرگرمی کی شکل میں بھی ڈھلی تھی۔ تخلیقی سرگرمی سے بڑا سوہنا عمل اور نہیں۔ اب نصیر شاہ ایک ردعمل میں بسر ہو رہے ہیں۔ البتہ ان کے دل میں کسی عمل کی یاد اب بھی باقی ہے۔ ان کی شاعری اسی عمل کا عکس ہے جو ردعمل کے روبرو آ کر ''برعکس'' بن جاتی ہے۔ اب ان کے ہر عمل میں ردعمل کی پرچھائیاں زیادہ ہوتی ہیں کبھی کبھی دونوں ایک ہوتے ہیں تو بہت عمدہ فن پارہ وجود میں آتا ہے۔ شاہ جی کے سامنے اس دھرتی پر جو کچھ ہوا اور اس دھرتی پر ان کے ساتھ جو کچھ

ہوا ان کے ادب پارے اسی ملی جلی اجڑی پچھڑی اور لہولہان زندگی کی نشانیاں ہیں۔ شاہ جی کی کہانیاں ''ہک پوسٹ کارڈ'' چٹھیاں قبراں'' کانی منجی'' ہک ماں دے دو پتر'' آپ بیتی اور جگ بیتی کی خوبصورت آمیزش ہیں۔

شاہ جی اپنی ناپسندیدگی میں بڑے کھرے ہیں کوئی کام کتنا ہی برا ہو اس کی اپنی ایک دیانت ہوتی ہے۔ شاہ جی اس دیانتداری میں بڑے سخت ہیں جس وقت اس شہر میں لوگ سونا چاندی اور قیمتی ساز و سامان لوٹنے میں مگن تھے تو شاہ جی لٹے پٹے گھروں سے کتابیں اٹھا کر گھر لے آئے یہ بھی ڈاکہ ہی ہے مگر کتابوں کو جلا کر راکھ کر دینے سے بہتر ہے کہ آدمی اٹھا کر گھر لے آئے۔ شاید یہی وہ کتابیں ہیں جنہیں جلا جلا کے شاہ جی نے سردیوں کی راتیں کاٹیں۔ ورنہ ان کے کچے میلے گھر میں انہیں کب کی دیمک لگ چکی ہوتی۔

شاہ جی ''انقلابی'' تو دیر سے بنے۔ پہلے وہ ''اسلامی'' تھے۔ شعروادب کے علاوہ انہوں نے دین کا مطالعہ بھی کیا ہے۔ وہ ایک دین دار گھرانے کے چشم و چراغ ہیں۔ ان کی دو کتابیں ''مجموعہ تفاسیر ابو مسلم'' اور ''موسیقی کی شرعی حیثیت'' بہت پہلے شائع ہوئی ہیں۔ دوسری کتاب ان کے ذہنی رجحان کی عکاسی کرتی ہے۔ لوگ گیتوں اور گیتوں میں گھٹتے ہوئے ثقافتی ماحول میں رہنے والا آدمی سر تال اور راگ رنگ سے وابستگی کے بغیر کسی طرح جی سکتا ہے۔ نصیر شاہ کے والد مولانا حکیم امیر علی شاہ عالم دین ہونے کے ساتھ ساتھ شاعر بھی تھے دینی کتابیں عربی فارسی میں لکھیں اور شاعری اپنی ماں بولی میں کی سارے علمائے دین شاعر ہو جائیں تو معاشرے میں کسی دوئی کا جھگڑا نہ رہے۔ ہمارے تقریباً تمام صوفی شعرا علمدین میں بھی بہت آگے تھے۔ مولوی شاعر ہوتا ہے تو صوفی بن جاتا ہے صوفی اندر کی روشنیوں اور گندگیوں کو ایک ہی نظر سے دیکھتا ہے۔ باہر کی اچھائیوں اور بدنیتوں کو بھی الگ الگ کر کے نہیں دکھاتا وہ دین دار اور دنیادار کے لیے معیار نہیں بناتا۔ دین و دنیا کا علم اور شعر و ادب کا ذوق نصیر شاہ کو اپنے گھر سے مل گیا۔ پھر وہ بے گھر ہو کے بھی اس ٹھکانے کی یاد کو محو نہیں کر سکے۔ وہ ہمیشہ ان لوگوں سے نفرت کرتے رہے جو دنیادار ہیں مگر بنے ہوئے دین دار ہیں اور جو دین دار ہیں مگر دنیاوالوں سے بھی آگے نکلے ہوئے ہیں شاہ جی اصل میں نہ دین کے خلاف ہیں نہ دنیا کے ان کی نفرت بامعنی ہے اور سچے لوگوں والی ہے وہ سرمایہ داروں جاگیرداروں ظالم حکمرانوں امیروں اور زندگی کے تمام لٹیروں کے خلاف ہیں۔ ان کی کہانیاں اور نظمیں غزلیں اسی جذبے کا آئینہ بن گئی ہیں۔ وہ کسی بڑی تبدیلی کے نقیب ہیں مگر جانتے ہیں کہ یہ تبدیلی آسانی سے نہیں آنے والی۔ ابھی نہیں آنے والی۔

پہلے پہل نصیر شاہ کچھ عرصہ جماعت اسلامی میں بھی رہے ہیں پھر علامہ پرویز کی فکر کے ساتھ اپنی سوچ ملا کے بھی دیکھ لی۔ ان

کے رسالے ''طلوع اسلام'' کے مستقل مقالہ نگار رہے پرویز کے کئی مضامین کا عربی زبان میں ترجمہ بھی کیا۔ بال آخر طلوع اسلام کی کشش بھی ان کے مضطرب ذہن کی ہلچل میں غروب ہوگئی۔ وہ عربی زبان کے اچھے بھلے لکھاری ہیں۔

مصر کے رسالوں ''الدین'' اور الاسلام میں بھی نصیر شاہ کے مضامین شائع ہوئے ہیں ایک عرب عالم تحسین المبارک نے اپنے ایک مضمون ''الادبا العربیۃ فی الباکستان'' میں جن تین آدمیوں کو عربی کا دبی تسلیم کیا ہے۔ ان میں سے ایک نصیر شاہ ہیں۔ باقی دو مسعود عالم ندوی اور محمد حسنی الندوی ہیں۔ شاہ جی نے ایک عرب ادیب حبیب محفوظ کے ایک ناول کا ترجمہ راکھ کے ڈھیر'' نام سے شروع کیا مگر اپنے اس راوے کو بھی پایہ تکمیل تک نہ پہنچا سکے ایک پختہ آوارگی کی لہران کے سوچ سمندر میں ہر وقت طوفان مچائے رکھتی ہے۔ وہ شعروادب کے جہانوں سے کئی بار بھاگ نکلے مگر کہیں اور جانہ سکے۔ اس دشت میں آدمی راہ بھول سکتا ہے مگر نکل کے جانہیں سکتا۔ کئی رسالوں اخباروں میں ان کی تحریریں شائع ہوئیں مگر اب کچھ بھی ان کے پاس محفوظ نہیں سوائے حالات اور خیالات' معاملات اور معمولات کی بے ترتیبی کے اس کیفیت میں بے قراریاں مرتی نہیں بے تعلق ہوجاتیں ہیں۔ مایوسیاں اس مقام پر پہنچ کر اظہار کی تمام صفات کو پہچان لیتی ہیں۔ نصیر شاہ کسی کمال کی منزل پر پہنچنا نہیں چاہتا۔ یہ منزلیں تو اس کے راستوں میں کھڑی ہیں اور شاہ جی جان بوجھ کر بھٹکے ہوئے پھر رہے ہیں۔ اپنے سارے سفر میں ایک سچی ترقی پسندی اور ایک انقلابی مستی ان کے تھکن سے آئے ہوئے وجود میں تڑپتی رہتی ہے۔ یہ مستی ان کی تخلیقی کاروائیوں میں سرمستی بن جاتی ہے کبھی کبھی بدمستی بھی بن جاتی ہے۔

شاہ جی نے اول اول کچھ دیر میانوالی کے ایک قصبے چکڑالہ کے ہائی سکول میں پڑھایا استعفیٰ دے دیا۔ 1957 میں میانوالی سے ایک رسالہ ''سوز وساز'' جاری کیا جوایک سال کی بعد بند ہوگیا۔ اس میں مذہبی اور دبی مضامین شائع ہوتے تھے۔ ہر طرف اس رسالے کی واہ واہ ہوئی۔ ایک رسالے ''شعاع مہر'' کے سرور پر شاہ صاحب کا نام بطور مدیر آتا با پنجاب کے ایک دور آباد اور پسماندہ علاقے سے ایک بھرپور اثر والا۔ رسالہ چلانا کوئی معمولی کام نہ تھا اس کے بعد شاہ جی نے مسلسل بے کاری اور بے روزگاری کا زمانہ گزرا۔ کبھی کچھ ٹیوشن کرلی کسی کے لیے لکھنے پڑھنے کا کوئی کام کردیا اور بس رفتہ رفتہ ایک گہری کاہلی کی چادر انہوں نے اوڑھ لی کتاب سے بھی ان کی درستی برائے نام رہ گئی مگر جو کچھ انہوں نے کبھی پڑھ لیا تھا۔ وہ انہیں نہیں بھولا ان کی فکر نے کئی بار فکرمندی کا روپ دھار لیا۔ لیکن ان کے لفظوں کا موڈ کبھی خراب نہیں ہوا۔ انہوں نے اپنی نظموں غزلوں اور دوسری تحریروں میں احتجاجی انداز اختیار کیا اور انقلاب کی تمنا لکھنے کی کوشش کی۔ اس سارے عمل میں اپنے تخلیق تجربے سے دھوکہ نہیں کیا۔ انہوں نے جب لکھا تو کسی ففنی ریاضت یا سوچے سمجھے منصوبے کے تحت نہیں لھا۔ ان کے خیالوں کی جلتی بجھتی آنکھوں میں لفظیوں ہیں جیسے کسی آدمی نے اپنے پاس کہیں

شراب چھپائی ہوئی ہو بندہ بوتل تو چھپا سکتی ہے نشہ تو نہیں چھپا سکتا۔ ان کا نظریہ فن مقصد کے دائرے بناتا ہے۔ روایتی رنگ روپ بھی اپنا آپ دکھاتا ہے۔ ان کے ہاں روایت کی تاثیر اور جدت کی تازگی گھل مل گئی ہے۔ ایک بے تکلف اسلوب کے بے دریغ استعمال کے ساتھ ایک کھلا ڈھلا لہجہ بنا ہے اس انداز میں بھی رمز اور راز کی کیفیت کو اپنے ساتھ جگائے رکھا ہے۔ جس طرح پرانے کنویں میں بہت نیچے پانی اور مٹی ملے ہوئے ہوتے ہیں۔ علامت اور کیال یکجان ہو کر اظہار پائیں تو ٹھیک ہے ورنہ علامت اکڑ کے اپنے ہونے کا اعلان کرے۔ یا کسی تحریر میں علامت کو الگ ڈھونڈ کے رکھنا پڑے تو پڑھنے والا تحریر سے وابستگی نہیں استوار کر پاتا۔ یہ روایتی فطری شان شاہ جی کے فن کو کلاسیکی حیثیت دینے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ بس وہ اب اس کام میں نت کرنے کے لیے تیار نہیں۔ ان کی ابتدائی شاعری میں پرانے ترقی پسندوں والی گھن گرج ایک براہ راست تخاطب کا قرینہ پیدا کر دیتی ہے۔ ان کے ہاں بے نیازی سے لکھنے کی عادت پکی ہو گئی ہے۔ ارتجالاً لکھنا' فرمائش پر لکھنا اور مجبوراً لکھنا ان کا ایک بے قاعدہ سا عمل ہو گیا ہے۔ اس کے باوجود ان کے لکھے ہوئے میں پختگی کی ادا باقی رہتی ہے۔ اگر وہ کبھی دل سے لکھیں اور اسے نگاہ کی زد پہ رکھیں تو کمال کی چیز برآمد ہوتی ہے۔ انقلاب کی دھن ان کے پاس سب سے پہلے نظر آ جاتی ہے۔ اب وہ شاعری اور زندگی دونوں کے بارے میں کچھ لاپرواہ سے ہیں جیسے یہ دونوں چیزیں ان کے پاس فالتو اور وافر ہیں۔ جنہیں تقسیم کرنے ضائع کرنے اور کبھی کبھی فروخت کرنے میں انہیں مزا آتا ہے۔ وہ صحافت میں رہے کچھ دانشورانہ سیاست میں بھی رہے۔ صحافیانہ اور ''سیاسیانہ'' سلسلہ ان کی تحریروں میں اپنا بانکپن دکھاتا رہتا ہے۔ اس بات کا کبھی تردد نہیں کرتے کہ اچھا لکھا جا رہا ہے یا اچھا نہیں لھا جا رہا انہیں اس کا افسوس بھی نہیں ہوتا۔ کہ جو کچھ میں نے لکھا ہے اس سے بہت بہتر لکھ سکتا تھا۔ تمنائیں صرف ان کے لہو میں کروٹیں لیتی رہتی ہیں۔ فطرت نے ان کو بڑے کمالات عطا کیے تھے۔ انہوں نے ان کے ساتھ وہی سلوک کیا جو زمانے نے ان کے ساتھ کیا ہے اس بات سے اندازہ لگائیں کہ انہوں نے اپنے پاس کھ محفوظ نہیں چھوڑا مگر جو کچھ بھی ہے اس سے کئی کتابیں بنائی جا سکتی ہین۔ اب جو ادبی ارادے ان کے ہیں۔ ان کی روشنی میں ابتدائی انقلابی شاعری پر مشتمل ایک مجموعہ ''تنکے اور طوفان'' اس کے بعد کی شاعری ''سانسوں کی زنجیر'' اور افسانوں کا مجموعہ ''چونکتی چنگاریاں'' اور دوستوں کے خاکے ''میرا البم'' زیر ترتیب ہیں بہر حال بغیر کسی خوف تردید کے اعلان کای جا سکتا ہے کہ اس وقت وہ میانوالی کے سب سے بڑے دانشور اور ادیب ہیں۔

شاہ جی جس طرح کی دنیا میں پھنس گئے ہیں۔ اس کے خلاف بیزاری ان کی عادت سی بن گئی ہے۔ یہ کوئی ایسی بری عادت نہیں۔ عادت جب فطرت بن جائے تو اس میں مثبت پہلو زیادہ نمایاں ہونے لگتے ہیں۔ شاہ جی زندگی کی مشکلات کی دلدل میں کھڑے ہیں

اوران کے اندر سمندر موجزن ہے۔خوبصورت ساحلوں والا علاقہ بھی ان کا دیکھا ہوا ہے۔ان کی شاعری میں اور کہانیوں میں ان علاقوں کی خاص جھلک نہیں ملتی۔ان منظروں کی بات زیادہ ہے جو وہ دوسری بار نہیں دیکھنا چاہتے تھے۔دکھ یہی ہے کہ یہی منظر انہیں بار بار دیکھنے پڑے ہیں۔شاہ جی کی ایک کہانی کا عنوان ہے۔''ہاں دا چانن'' اندر کی روشنی شاہ جی اس بات کے قائل ہیں کہ آنکھوں پہ ہاتھ رکھا جاسکتا ہے۔دل کی روشنی تو ختم نہیں کی جاسکتی شاہ کی تھوریریں دل اور دماغ دونوں روشن کر دیتی ہیں۔ان کی کہانیوں کی کتاب کا نام ''کگرے دے پھل'' بھی قابل غور ہے''ککراں دی چھاں'' کے عنوان سے میں نے اس کا دیباچہ لھا ہے یہ چھاؤں تھکے ہوؤں کے لیے مزید ارراحت ہوتی ہے۔ککر ہمارا پرانی سنگی شجر ہے یہ درخت کچھ لوگوں کے لیے آب آؤٹ آف فیشن درخت ہے۔ ان کے لیےاس طرح کے بندے بھی کسی کام کے نہیں ہماری زمین پر اب درخت باہر سے لا کر گاڑے جارہے ہیں۔وہ اس سے بے خبر ہیں کہ ککر کے خواص اور تاچیر کیا کیا ہے۔پھر انہیں یہ کیسے علم ہوگا کہ یہی صفات شاہ جی کی کہانیوں اور دوسری تحریروں میں بھی ہے نصیر شاہ خود ککر کا ایک درخت ہے۔

◆◆◆

لاہور کا کشمیری دروازہ

کلیم اختر پہلے نمبر پر صحافی ہیں مگر وہ اس زمانے کے آخری آدمیوں میں سے ہیں جب صحافت کا میدان ادیبوں شاعروں سے بھرا ہوا تھا۔ بہت سے لکھنے والوں نے اپنی تحریروں میں صحافت اور ادب کی سرحد کی ہمیشہ پاسبانی کی اور صحافت کو ملازمت کے کمرے میں بند رکھا۔

کچھ لوگ تھے جنہوں نے لکھا تو یہ نہیں دیکھا کہ وہ ادب لکھ رہے ہیں یا صحافت کر رہے ہیں۔ سو ان کی تحریروں میں یہ دونوں ذائقے برابر برابر گھل مل گئے۔

کلیم اختر صحافیوں میں صحافی ہیں اور ادیبوں میں ادیب ہیں۔ آج کل اخباری کالموں میں ہماری تاریخ کا لمحہ لمحہ محفوظ ہوتا چلا جا رہا ہے۔ ان کالموں پر مبنی کتابیں بھی شائع ہو رہی ہیں اس طرح یہ تحریریں خود بخود کسی نہ کسی حد تک ادب کے زمرے میں آ جاتی ہیں۔ کلیم اختر کے مضامین بھی بیک وقت ادب اور صحافت کے خانوں میں علیحدہ علیحدہ رکھے جا سکتے ہیں۔

کلیم اختر نے ان موضوعات پر بھی لکھا ہے جو خالصتاً ادب کی ذیل میں آتے ہیں اقبالیات پر لکھے گئے ان کے مضامین پڑھ کر دہری انساط کا احساس ہوتا ہے۔ ایک ٹکٹ میں دو دو مزے اصل میں وہ کشمیریات کے آدمی ہیں ان کا سینہ کشمیری تہذیب و تاریخ کا گنجینہ ہے۔ اگر چہ اب ان کی شخصیت میں لہودیوں کے سارے انداز جمع ہو کر بکھرے ہوئے ہیں۔ پرانے لاہور میں ایک کشمیری دروازہ بھی ہے۔ لاہور میں اب اصل کشمیری دروازہ کلیم اختر ہیں۔ ان سے ملتے ہی دروازہ آپ سے آپ کھل جاتا ہے اور ہر بار نئے منظروں کا کوئی افق نمودار ہوتا ہے۔

جو کچھ انہوں نے کشمیر میں دیکھا ہے۔ جو کچھ کشمیر کے بارے میں سنا ہے جو کچھ کشمیر کے بارے میں پڑھا ہے ذرا بھر ان کو نہیں بھولا۔ یہ کشمیر کی دل کشی اور کشمیر سے ان کی وابستگی کا ثمر ہوگا اس سلسلے میں ان کی یادداشت حیران کن بلکہ پریشان کن ہے اپنی پوری جزئیات سمیت وہی چیز یاد رہ جاتی ہے جس نے آدمی کو بہت زیادہ دکھی کیا ہو یا بہت زیادہ سکھی کیا ہو۔ یقیناً یہ دونوں باتیں کشمیر کی نسبت سے کلیم اختر کا تجربہ بنی ہوں گی کشمیر کی محبت اور کشمیر کی جدائی ان کی متاع بے بہا ہے۔ ان سے دس مرتبہ سنا ہوا واقعہ پھر سنا جائے تو وہ ایک لفظ بھی اپنی جگہ سے ادھر ادھر نہیں ہونے دیتے اور بیان کی تازگی اور طراوت میں کمی بھی نہیں آنے پاتی۔

کلیم صاحب نے اتنے مضامین لکھے ہیں کہ ان کے لیے بے شمار کا لفظ استعمال کرتے ہوئے ہچکچاہٹ نہیں ہوتی۔اس انبار میں سے کشمیریات کے حوالے سے لکھے گئے مضامین کو الگ کرلیا جائے تو یہ ڈھیر بھی بظاہر ویسے کا ویسا رہے گا۔

اردو میں کشمیریات کے سلسلے کا سب سے بڑا نام محمد الدین فوق کا ہے پھر پروسیر علم الدین سالک میرا عبدالعزیز مولانا عبداللہ قریشی اور کلیم اختر کا نام آتا ہے۔میں نے فوق کشمیری پر پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھا ہے۔یہ کام قریشی صاحب اور کلیم صاحب کی کھلی امداد کے بغیر میرے لیے ممکن نہ تھا۔ پروفیسر سالک اور عبداللہ قریشی کشمیری نہیں انہیں اعزازی کشمیری کا خطاب دیا گیا۔اب پنجاب یونیورسٹی لاہور میں شعبہ کشمیریات کے بانی ڈاکٹر یوسف بخاری یہاں کشمیر کے سفیر کا درجہ حاصل کرتے جارہے ہیں انہوں نے کشمیر کے پروانوں کو شمع یعنی شعبہ کے گرداگرد اکٹھا کرنا شروع کردیا ہے۔غالباً دنیا میں کشمیریات نام کا یہ پہلا شعبہ ہے۔اس ضمن میں بخاری صاحب کو صدر شعبہ اردو ڈاکٹر خواجہ زکریا اور وائس چانسلر ڈاکٹر رفیق احمد کا تعاون بھی حاصل ہے۔اس شعبے میں ایم اے کی پہلی کلاس کو پڑھانے والوں میں کلیم اختر بھی شامل ہیں۔

کلیم اختر کشمیری تاریخ کی انسائیکلو پیڈیا ہیں۔میں نے ان سے کہا ہے کہ وہ اگر اپنی آپ بیتی بھی لکھیں و یہ کشمیر کی ایک مکمل کہانی ہوگی جس میں کئی زمانوں کی روداد سمٹ آئے گی۔

کلیم صاحب اپنے مشاہدے سے اور سماعت کو ایک جیسا عمل بنانے کی اہلیت رکھتے ہیں۔اپنی یادداشت اور مطالعے سے ایک جتنا کام لینا بھی جانتے ہیں۔کلیم صاحب نے ان سب لوگوں کو ایک زندہ روایت کے طور پر متعارف کرانے کی کوشش کی ہے جو کشمیر سے محبت رکھتے ہیں۔ان شخصیات کے حوالے سے بھی مضامین لکھے ہیں جو اہل کشمیر ہیں اور اقبال دوست ہیں۔کلیم اختر کی یہ کتاب اقبالیات اور کشمیریات کا ایک وقیع اور دل کش امتزاج ہوگی۔''اقبال اور کشمیر'' کے نام سے پروفیسر جگن ناتھ آزاد ڈاکٹر صابر آفاقی اور سلیم خان گمی کی کتابیں بھی اہمیت کی حامل ہیں۔کلیم اختر کی کتاب اس سلسلے میں ایک مختلف اضافہ ہوگی۔

وادی کشمیر میں ٹوٹنے والے عذابوں کی اپنی ایک تاریخ ہے کلیم اختر بھی خاک وخون کے کئی دریا پار کرکے لاہور پہنچے ہیں۔اب وہ کنارے پہ کھڑے دکھائی دیتے ہیں مگر یہ سب دریا ان کے اندر بہ رہے ہین۔انہیں فکر ہے کہ یہ سیل خوں کہیں سب کچھ بہا کر نہ لے جائے مگر ان کے خیال میں ظالموں کی حیثیت بھی خس وخاشاک سے بڑھ کر نہیں۔

کلیم صاحب کشمیر کے لیے قربانیوں کی کہانیوں کے عنوانات تلاش کرتے رہتے ہیں آزادی کے متوالوں کا ذکر کرتے ہوئے ایک والہانہ پن ان کے سراپے پر لہرانے لگتا ہے۔لگتا ہے جیسے ان بہادر لوگوں نے یہ کارنامے ان کے ساتھ مل کر انجام دیے ہیں۔وہ

اپنے دفتر میں بیٹھے ہوئے محاذ پر ہیں۔ وہ ان لوگوں کے نام بتانے سے بھی گریز نہیں کرتے جنہوں نے سازشوں اور خواہشوں کو یک جان کر کے اپنے لہو میں گھول لیا۔ لہو سفید بلکہ کالا ہو گیا۔ کلیم اختر کے بیانات میں کہیں چمکتے ہوئے لہو اور کہیں کالے لہو کے چھینٹے صاف صاف بلکہ الگ الگ دکھائی دیتے ہیں وہ مسلم کشمیر کے لیے اسی طرح حزن وملال کی تصویر رہیں جس طرح مسلم ہندوستان کا خواب اپنی تعبیر کے لیے ترس رہا ہے۔ اس حوالے سے پاکستانی تاریخ کے سیاسی افق پر ٹوٹتے ہوئے ستاروں کی آنکھ مچولی کی منظر کشی کبھی خوش آئند اور کبھی بھیانک صورت اختیار کرتی ہے۔ ہمارے اکثر لیڈروں نے منافقت اور مفاد کو ایک لباس پہنا دیا اور پوری قوم کو عریاں کیا بلکہ رسوا کیا۔ انہوں نے اپنی اپنی تفریح گاہوں اور نشاط کدوں کی وسعت اور حفاظت کی خاطر کشمیر جنت نظیر کو بھارتی حکومت کا پائیں باغ بننے میں ہر ممکن سہولت فراہم کر دی۔ اپنے خطہ جمال میں آتش چنار کی دلربائی دیکھنے والے کشمیریوں نے جہنم زار میں ہونے کے مزے بھی چکھے سوچتا ہوں ان کے دل پر کیا گزرتی ہوگی؟ میں تو اپنی اس واردات کو بیان کرنے سے بھی قاصر ہوں جو ایسے لمحوں میں کلیم اختر کی محفل میں میرے دل پر گزر جاتی ہے۔ ہمارے پاس کشمیری دروازہ ہے مگر کشمیر نہیں ہے۔

◆◆◆

ناول میں سفرنامہ

رحیم گل کے ناول کا نام چونکا دینے والا ہے۔ مجھے اس طرح کی فلمیں دیکھنے کا بھی شوق ہے۔سونے کی تلاش میکانز گولڈ قاتل کی تلاش مشن فار اے کلر میں نے سمجھا کہ شاید یہ بھی کوئی جاسوسی ناول ہے اور اس کا انگریزی نام یقیناً آن سرچ آف این اینگری گرل'' ہوگا۔اس ناول کے آخر میں پتہ چلتا ہے کہ باغی فلسفلے میں لتھڑی ہوئی ان تھک گفتگو کرنے والی ایک ''مایوس ناک'' لڑکی کو رام کر لینا اور راہ راست پر لے آنا جنت حاصل کر لینے کے مترادف ہے۔ یہ ہے بھی سچ۔اگرچہ اسے ڈیڑھ اینٹ کی جنت تعمیر کرنا ہی کہا جائے گا۔ لیکن یہ معلوم نہیں کہ اس جنت میں بھی امتل صرف باتیں باتین غی کرتی ہے یا اس ''یا کے بعد ناول جاسوسی کی بجائے جنسی ہو جائے گا۔

اب اگرچہ جاسوسی اور جنسی میں کوئی خاصی فرق نہیں رہ گی رحیم گل کے اس ناول میں جتنی خوبیاں ہیں اور جتنی خامیاں ہیں ان کی تنہا ذمہ داریہی لڑکی امتل ہے۔

سارا ناول اس کے گرد گھومتا ہے۔رحیم گل بھی اس کے دو آلے چکر کھاتا نظر آتا ہے رحیم گل ایک بوڑھا پٹھان ہے۔ پٹھان اس عمر میں ضدی ہو جاتے ہین۔وہ کسی اجنبی مسافر کو صرف اس لیے بھی گولی مار دیتے ہیں کہ تو ہمارے ہوتے ہوئے کسی دوسرے پٹھان کے ہاں مہمان بن کر کیوں ٹھہرا ہے۔

رحیم گل اپنی لاٹھ لے کر اس کا کی کا ساتھ دینے کی کوشش کر رہا ہے۔ویسے یہ سودا مہنگا نہیں۔ چھا بھلا ناول لکھا گیا اور سیر سپاٹا مفت کا ناول پڑھتے ہوئے کئی بار میں نے خود کو ٹٹولا اور محسوس کیا کہ کہیں مجھے بھی رحیم گل کی اس امتل سے کوئی عشق وغیرہ تو نہیں ہو گیا۔گل خان کے پاس ایک طویل فہرست ایسے عاشقوں کی تھی۔ اس نے جھٹ میرا نام بھی اس فہرت میں لکھ دیا۔ میرا نمبر غالباً 3.2 تھا۔اب ایک چھوٹے موتے پٹھان کی حیثیت سے مجھ پہ لازم ہے کہ میں کم از کم اپنے ایک رقب کو قتل کروں یا امتل ہی کو اغوار کرلوں۔اگر ایسا ہوا اور یہ ضرور ہوگا تو مجھے یقین ہے کہ رحیم گل اس کشمکش میں ایک اور ناول لکھیں گے۔ ''جہنم سے فرار''

میں نے یونہی سوچا کہ ہمارے ہاں ایسی باتیں کرنے والی کون خاتون ہو سکتی ہے۔کبھی کبھی امتل جب بہت مردناک اور پر جوش ہوتی ہے تو کسی پر ہلکا سا گمان گزرتا ہے۔مگر وہ بالعموم بالکل اور طرح یعنی صرف اپنی طرح باتیں کرتی ہے۔رحیم کی امتل پتلے بانس کی

بوڑھی کے آخری حصے جیسی ہے جہاں آدمی گرتا نہیں لڑکھڑاتا ضرور ہے پھر مجھے دو چار نئی شاعرات کے شعر یاد آئے امتل کی باتیں سنتے ہوئے مجھے عطاالحق قاسمی کا یہ فقرہ اڑتا ہوا سنائی دیا جو اس نے ایک حسین اور ذہین خاتون کی تقریر کے بارے میں کہا تھا کہ لوگ اسے ٹکٹکی باندھ کر سنتے رہے۔

فقط اس شوق میں پوچھی ہیں ہزاروں باتیں
میں ترا حسن ترے حسن بیان تک دیکھوں

میں ڈائیلاگ ود فرینڈز کو ترجیح دیتا ہوں۔مگر ڈائیلاگ لیڈیز کا اپنا ایک مزا ہے۔اور یہ مزا ''جنت کی تلاش'' میں تھوک کے حساب سے موجود ہے۔

ایک پشتو سپیکنگ ادیب کی اردو میں یہ مکالمہ نگاری حیرت انگیز حد تک خوبصورت ہے صیغہ واحد متکلم میں بات ہوتی ہے تو ہر پڑھنے والا خواہ مخواہ سمجھنے لگتا ہے کہ جیسے وہ خود واحد متکلم میں بات ہوتی ہے تو ہر پڑھنے والا خواہ مخواہ سمجھنے لگتا ہے کہ جیسے وہ خود امتل سے ہمکلام ہے۔یہ مکالمہ نگاری کا کمال ہے کہ جہاں وہ اختلاف بھی کرتی ہے تو اگرچہ کبھی کبھی فضول فلسفہ بگھارتی ہے مگر اس کا کیا کیا جائے کہ ظالم بات کرتی ہوئی اچھی لگتا ہے۔اور کبھی کبھی اچھی نہیں بھی لگتی جب اپنے سے بھی زیادہ خوبصورت منظروں میں گھری ہوئی بھی تقریر جاری رکھتی ہے تو معاف کیجئے کچھ کچھ بور کرتی ہے۔ بہت زیادہ باتونی عورتیں بور کرتی ہیں۔زیادہ خوبصورت کو رعایتی نمبر مل جاتے ہیں۔امتل بھی س پرچے میں اچھے نمبروں میں پاس ہوئی ہے اس ناول میں امتل کا خاکہ سب سے مزیدار تخلیق ہے رحیم گل نے اور بھی یار رہ جانے والے خاکے لکھے ہیں۔وہ خاکہ نگاری اور کردار نگاری میں فرق نہیں کرتا۔اس نے ناول اور سفرنامے کو بھی رلا ملا دیا ہے۔

جب میں گورنمنٹ کالج لاہور میں پڑھتا تھا ایک لڑکی کا نام امتہ الحفیظ یا امتہ الرشید تھا۔اس کی سہیلیاں اسے امتل امتل کہتی تھیں۔ایک ساتھ حیران اور پریشان کر دینے والی باتیں کرتی تھی۔ مجھے کیا خبر تھی کہ وہ رحیم گل کے ساتھ کاغان مری جھیل سیف الملوک کا ایک چکر لگائے گی اور وہ ایک ناول لکھ لے گا۔لڑائی جھگڑے کے شوقین پٹھانوں سے اس طرح کے مہذب معرکوں کی توقع کم ہوتی ہے کبھی کبھی عیسٰی خان اور موسیٰ خان کے بیٹے پیغمبروں جیسی صلاحیت پیدا کرنے میں کامیاب ہو ہی جاتے ہیں وہ جو میری کلاس فیلو امتل تھی میں اس کی باتوں کی بجائے اس کی آنکھوں میں جنت کی تلاش کرتا رہا۔وہاں مجھے بے رنگ آنسوؤں میں ہر بار دو پار ڈبکیاں کھانے کے اور کوئی تجربہ نہ ہوا۔بے نام آگ میں جلتی ہوئی اس لڑکی کی آنکھوں میں کچھ ان دیکھا سا رہ گیا۔جسے رحیم گل

جھیل سیف الملوک پر جا کر بھی نہ دیکھ سکا۔''جنت کی تلاش'' میں جہاں گفتگو اور جستجو میں مماثلت پیدا ہوتی ہے تو بہت ترفع پیدا ہوتا ہے۔ ہمکلامی جب تک ہمراز کیفیتوں میں نہیں ڈوبتی۔ اس وقت تک کہیں کوئی ایسا مقام نہیں آ سکتا جہاں آدمی اکٹھا رہ سکے۔ میرے نزدیک محبت کے ساتھ اکٹھا رہنا جنت میں رہنے کے برابر ہے۔

رحیم گل کے ہاں ہمکلامی ایک دلچسپ ہمسفری سے ہم آغوش ہوتی چلی گئی ہے۔

اور مجھے کئی بار ایسے لگا کہ کہیں یہ ناول سفرنامہ ہی نہ ہو۔ اب ناول اور سفرنامے کے راستے ایک ہوتے جا رہے ہیں۔ یہ کوئی عیب کی بات نہیں۔ ایک طرح سے نئی ہنرمندی کا آغاز ہے۔ زندگی بذات خود ایک سفر ہے ہم کسی بھی صنف میں جو کچھ لکھ رہے ہیں کسی نہ کسی کے سفر کی روداد ہی تو ہے۔ نثر میں آئندہ سب سے زیادہ زندہ رہنے والی صنف سخن سفرنامہ ہوگی۔ اس طرح میں رحیم گل کے ایک کامیاب ناول نگار ہونے کی نفی میں نہیں کر رہا اس کی طرف سے پھوٹنے والے نئے امکانات کو خوش آمدید کہہ رہا ہوں۔ اس نے ارض وطن کے حسن اور ارض جان کے حسن بیان کو ملا کر جلال و جمال میں گندھا ہوا ڈونگا مشاہدہ اور طویل مکالمہ ایک دلکش مطالعہ بنا کر ہمارے سامنے پیش کیا ہے اس سرزمین پر فطرت نے جو دستخط کیے ہیں وہ پہاڑوں جنگلوں جھیلوں پھولوں پرندوں کی شکل میں اس ناول میں بھی دکھائی دیتے ہیں۔ انسان ان دستخطوں کی بجائے اس تحریر میں زیادہ کھب جاتا ہے جو اس کے ذہن میں ہے اور اس کی زبان پہ ہے مثلاً ناول میں کئی جگہوں پر میرا جی بڑے زور سے چاہا کہ کاشی اس وقت یہ لڑکی امتل چپ کر جائے مگر وہ مانتی ہی نہیں اسے رحیم گل تو اتنا تو سمجھاتا کہ اس کے پاس صرف ذہن ہوئے دلوں کی ہونی چاہیے۔ جنت کی جو تصویر ہمارے جاہل مولوی صاحبان پیش کرتے ہیں یا جس کا نقشہ ''مرنے کے بعد کیا ہوگا'' میں کھینچا گیا ہے میں اس کے بارے میں کہتا تو کچھ نہیں چاہتا البتہ وہاں جانے کے لیے بھی تیار نہیں ہوں۔ انسان نے خدا بن کر جنتیں بنالی ہیں۔ کئی فلسفیوں نے یوٹوپیا کے خواب دیکھے جن کا ترجمہک خیالی جنت کیا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ حقیقی جنت کے بھی محض خیالی سمجھا جانے لگا۔ رحیم گل کے ناول کے سہارے ہم بھی جنت میں جیسے پہنچ تو جاتے ہیں مگر ہمیں یہ پتہ نہیں چلتا کہ ہم کہاں پہنچے ہیں۔ اس ناول میں موجود تمام کرداروں کے نزدیک جنت کا تصور الگ الگ ہے ناول میں دردمند ڈاکٹر ہجوم سے فطرت کے طرف اور بی بی امتل فطرت سے ہجوم کی طرف لوٹتی ہے۔ ایک فطرت اور ایک ہجوم آدمی کے اندر بھی ہے۔ وہاں جنت کی تلاش کے لیے رحیم گل نے شاید ایک اور ناول لکھنے کا ارادہ کیا ہو ویسے صبح جنت طلوع ہونے کے لیے آدمی کے دل میں اور دنیا میں ایک مشابہت اور مطابقت پیدا ہونا ضروری ہے پھر اس جہان اور اس جہان کی سرحدیں مل جائیں گی۔ عمر بھر اس جہان کے دوزخ میں جلنے والوں کو اجر کون دے گا اور کچھ لوگ دنیا میں جنت ساتھ لے کر ہی کیوں پیدا ہوتے ہیں اس دنیا میں اس

صورت حال کا ذمہ دار کون ہے۔

رحیم گل نے جیسے اپنے وطن پر جنت کی تلاش کے لیے درخواست لکھی ہو اور وہ اس ناول میں منتقل ہو گئی ہو۔

اب تو یارب تیرے فردوس پہ میرا حق ہے
تو نے اس دہر کے دوزخ میں جلایا ہے مجھے

◆◆◆

تحقیق کا رفیقانہ اسلوب

محترمہ زہرا معین نے اردو ادب کی ایک نامور شخصیت پروفیسر آل احمد سرور کی آپ بیتی مرتب کی ہے جسے ''حرف سرور'' کے نام سے نذر سنز نے شائع کیا ہے راز کی بات یہ ہے کہ سرور صاحب نے اپنی کوئی باقاعدہ آپ بیتی لکھی نہیں۔ ان کے مختلف مضامین کو جوڑا کر اور ان کی متعدد تحریروں کو ایک خاص ترتیب سے جمع کر کے ایک مکمل آپ بیتی بنالی گئی ہے۔ یہ تحریر میں کئی رسالوں اور کتابوں سے حاصل کی گئی ہیں۔ بلکہ بعض تحریروں میں سے اقتباست اور بعض اقتباسات میں سے چند سطریں لی گئی ہیں اور انہیں ایک دوسرے سے اس طرح پیوست کیا گیا ہے کہ ایک رواں تحریر بن گئی ہے اور اگر محترمہ زہرا نے حوالہ جات کے ذریعے تصدیق ناموں کو شامل نہ کیا ہوتا تو شاید ہے کمال یہ ہے کہ اس تسلسل کو قائم رکھنے کے لیے محترمہ زہرا نے اپنی طرف سے ایک بھی فقرہ نہیں لکھا۔ بقول ان کے اپنے

''سارے حرف انہی کے ہیں۔''

محترمہ زہرا کی یہ کتاب'' مرتبہ تحقیق و تدوین کے میدان میں ادبی جانفشانی کی ایک مثال ہے۔ یہ کام تحقیقی ذوق وشوق بلکہ تحقیقی جدو جہد کی گواہی ہے اس قدر محنت میں اگر محبت شامل نہ ہوتو یہ ممکن ہی نہیں۔ محترمہ زہرا کے سگھڑ پن کی شائستگی کا ایک نمونہ یہ بھی ہے کہ انہوں نے جیسے مختلف قسموں اور مختلف رنگوں کے کپڑوں کے پیوند لگا لگا کر ایک قبائے فاخرہ تیار کی ہے۔ جسے پہن کر سرور صاحب بہت خوش ہوئے ہوں گے اور انہیں اس انداز میں دیکھنے والوں نے بھی خوشی محسوس کی ہوگی۔

یہ شاید آ بیتی کا ایک منفرد انداز ہے یعنی سرور صاحب کی آب بیتی محترمہ زہرا نے ''تیار'' کی ہے مجھے یہ بھی یقین ہے کہ یہ تحریریں سرور صاحب نے اپنی آپ بیتی کے لیے نہ لکھی ہوں گی۔ البتہ ایک بات ایک بار پھر ثابت ہوگئی ہے کہ بڑے لکھنے والوں کی تحریروں میں ان کی شخصیت اور زندگی کس طرح در آتی ہے۔ اور دوسری بات یہ کہ تلاش کرنے والے کیا کیا کہاں کہاں تلاش کر لیتے ہیں۔ پھر تو یہ بھی حقیقت ہے کہ خطوط غالب کے ذریعے ان کی آپ بیتی تیار کی جاسکتی ہے۔ کوئی چاہے تو دیوان غالب کی ایک خاص ترتیب سے بھی یہ کام کیا جاسکتا ہے۔ یہ کام بھی محترمہ زہرا کرسکتی ہیں۔ انہوں نے تو سرور صاحب کے دردور بکھرے ہوئے حرف کی مدد سے یہ کام کر دکھایا ہے تحریر آدمی کا آئینہ ہوتی ہے۔ اسلوب و انداز تو شخصیت کے مزاج اور مقام تک کا پتہ دیتا ہے ایک ادبی سکالر کا خیال

ہے۔

کسی بھی ادیب کی کوئی ایک تحریر اس کی آپ بیتی کے لیے کام آ سکتی ہے۔

''عرض مرتب'' کے عنوان سے اس تحریر کے آغاز میں یہ جملہ بھی قابل ذکر ہے۔

''پروفیسر آل احمد سرور ان گنی چنی شخصیات میں سے ہیں جن کے بعض خیالات سے پورا اتفاق نہ کرتے ہوئے بھی طالب علمی کے زمانے ہی سے جن کا مجھ پر بہت اثر رہا ہے۔''

محترمہ زہرا نے ''حرف سرور'' کا انتساب پروفیسر آل احمد سرور کے عزیز دوست اپنے شوہر ڈاکٹر معین الرحمن کے نام کیا ہے اور پروین شاکر کا یہ شعر بھی ان کی نذر کیا ہے

مجھے ہر کیفیت میں کیوں نہ سمجھے

وہ میرے سب حوالے جانتا ہے

پروین کا یہ شعر اچھا ہے مگر یہاں اس شعر کا مزا کچھ اور طرح کے سرور کیف سے بھر گیا ہے اور اس کے معنی کسی اور رنگ میں چمک رہے ہیں میر کا ایک شعر بھی انتساب کا حصہ ہے عجیب بات ہے کہ یہ شعر بھی ایک نسوانیجذبے کی سپردگی کا انداز رکھتا ہے۔

دل میں مسودے تھے بہت پر حضور یار

نکلا نہ ایک حرف بھی میری زبان سے

ان دو شعروں میں دو لفظ تحقیق و تدوین کے فن سے ان کی دلچسپیوں کی نمائندگی کر رہے ہیں ''مسودے'' ''حوالے'' محقق اگر شاعر ہو بلکہ شاعرہ ہو تو تحریر میں ایک تخلیقی جھلک شامل کر کے منظروں کو عام دیکھنے والے کے لیے بھی قابل دید بنایا جا سکتا ہے۔

ایسی بات شان الحق حقی نے بھی کہی ہے۔

''بیم زہرا معین نے حسن ترتیب کا حق ادا کر دیا ہے۔ آدمی کچھ کرنا چاہیے

تو پتھر کو بھی جونک لگا کر لہو کھینچ سکتا ہے۔ زہرا نے یہی کچھ کیا ہے تمام مواد کو کتنا قابل مطالعہ بنا دیا ہے۔ یہ صرف محنت کا نہیں متخیلہ کا کام بھی ہے۔''

محترمہ زہرا نے ''عرفان اقبال کے نام سے بھی ایک کتاب مرتب کی ہے جس میں اقبال سے متعلق سرور صاحب کے مضامین کو جمع کر دیا ہے ''عرفان اقبال'' کے بارے میں سرور صاحب کی رائے ملاحظہ کریں۔

''عرفان اقبال'' کے مضامین جس طرح مرتب ہوئے ان کا اگرچہ مجھے پہلے سے علم نہ تھا مگر ان کی ترتیب کا حسن اور خصوصاً دوسرے مضامین میں سے اقبال کے متعلق اشارات کا شمول ہر لحاظ سے قابل قدر ہے۔ اس طرح کے متعلق میرے خیالات کو سمجھنے میں بڑی مدد ملے گی۔''

ہمارے ہاں مرتب کیا گیا کام تو بہت ہوا ہے مگر ''حرف سرور'' اس سے ذرا مختلف کام ہے جسے خود سرور صاحب نے ایک کارنامہ کہا ہے

''حرف سرور'' کے اسلوب ترتیب وتدوین کے سلسلے میں محترمہ زہرا کے یہ الفاظ ذہن میں رہیں تو اس کتاب کے تجزیے میں بڑی مدد ملے گی۔''

''سرور صاحب کے نزدیک شخصیات کا حسن ذہانت کی چمک دمک میں نہیں کردار کی استواری اور مضبوطی میں ہے۔ جو زندہ اور توانا خیالات سے آتی ہے۔ سرور صاحب کی شخصیت کے حسن تک پہنچ اپنے اور اسے اپنی گرفت میں لانے کے لیے میں نے یہی راستہ اختیار کیا ہے یعنی نظر زیادہ تر ان کے ''خیالات'' پر رہی ہے۔ محض ''حالات'' پر نہیں۔''

مجھے بھی پروفیسر سرور صاحب سے ملنے کا شرف حاصل ہے ایک تقریب میں کچھ دیر ان سے گفتگو بھی ہوئی۔ ان کی تحریریں پڑھنے کا اتفاق بھی ہوا ہے۔ مگر ان سے میری مکمل اور مفصل ملاقات اب ہوئی۔ جب میں نے ''حرف سرور'' پڑھی میرے خیال میں ملاقات دو آدمیوں کے درمیان ہوئی ہے۔ جب ہمکلامی اور خود کلامی ایک تجربہ بن جائے۔ ہجوم میں مکالمے کا انہماک ٹوٹنے نہ دینا بھی ایک فن ہے مگر ہر شخص فنکار تو نہیں ہوتا۔ لوگوں کی موجودگی میں باتیں تو ہو سکتی ہیں گفتگو نہیں ہو سکتی۔ ہم بکھرے ہوئے خزانے بنتے جا رہے ہیں محترمہ زہرا نے بکھرے ہوئے ایک خزانے کو ایک جگہ جمع کر دیا ہے جمع کر کے سجا دیا ہے۔ اس کتاب کے ذریعے سرور صاحب کے ساتھ ملاقات کے دوران کچھ دور کچھ دیر محترمہ زہرا دکھائی دیتی ہیں۔ مگر ان کی اس موجودگی میں موجودگی کے سارے قرینے پائے جاتے ہیں۔ یہ خصوصیت صرف ان کے تحقیقی اسلوب ہی میں نہیں جھلکتی۔ ان کی مجموعی شخصیت کے عمومی مزاج مین بھی رچی بسی ہے۔

محترمہ زہرا کے پس نظر سرور صاحب کی تصویر نہیں۔ ان کی تحریر ہے محترمہ کی نگارہ چہرے کے تاثرات سے زیادہ حرف کی حرکات پر پڑتی ہے۔ انہوں نے خود ''خیالات'' کو حالات'' پر ترجیح دی ہے۔ البتہ خیالات کے ذریعے حالات کی خبر بھی ملتی ہے۔ یہی وہ کنی ہے جس کے ذریعے کسی شخصیت کے سارے بند دروازے کھولے جا سکتے ہیں۔ ''حرف سرور'' میں شامل ہر تحریر ایک نیا دروازہ

کھلنے کا منظر نامہ بنتی ہے۔ ''بچپن کے اثرات اور تعلیم'' آگرہ میں چار برس'' علی گڑھ میں دو روز'' علی گڑھ سے دور لکھنو میں۔'' اور کچھ اہم واقعات'' میں سرور صاحب کی زندگی کے مختلف زمانوں کی جھلک ملتی ہے۔ایک حسن ترتیب سے یہ تحریریں آپ بیتی کے کچھ ورق معلوم دیتے ہیں۔ '' کچھ دن پاکستان میں'' اور پاکستان کا دسرا پھیرا میں سفرنامے کا معروف انداز نہ ہوتے ہوئے بھی سفر نامے جیسی خوشبو ہے۔آپ بیتی بھی ایک طرف سے سفر نامہ ہے۔ ''حرف سرور'' کے پہلے باب کا عنوان ہی ''میرا سفر حیات'' ہے کسی ممتاز ''اہل حرف'' کی زندگی ایک فکری تسلسل میں ایسے سفر کی داستان ہوتی ہے جو عام مسافروں کی کہانی سے مختلف ہوتی ہے۔سرور صاحب کے مضمون ''میری پسندیدہ کہانیاں'' پڑھنے کے بعد ان کی دوسری عمومی اور خصوصی ترجیحات کو سمجھنے میں بھی مدد مل سکتی ہے۔''تنقید کے بارے میں میرے تصورات'' اور ''بطور نقاد مجھ سے کچھ سوال جیسے تیکنیکی مضامین پڑھ کر بھی مجھے لطف آیا اگر چہ میں مزاجاً ایسی تحریروں سے ذرا کتراتا ہوں یا ایسی تحریریں مجھ سے کتراتی ہیں میرے خیال میں تحقیق وتخلیق میں فرق کو کم کیا جا سکتا ہے۔ان دونوں حروف کا ہم قافیہ ہونا ایک ایسی مماثلت ہے جو میرے لیے اہم ہے کہ میں شعر کہتا ہوں۔تنقید کے عمل میں ''خواہ وہ ادبی ہی ہو'' ایک منفی لہر کہیں نہ کہیں موجود رہتی ہے۔ ''حرف سرور'' کی ترتیب میں جس رغبت کو ملحوظ رکھا گیا ہے اس کی وجہ سے تنقیدی نوعیت کے مضامین میں بھی واردات کا ذائقہ پیدا ہو گیا ہے میں نے سرور صاحب کا مضمون ''میری شاعری'' پڑھا تو میں نے شاعری اور تحقیق کے فن میں ہم آہنگی اور ہمرنگی کو محسوس کیا۔محترمہ زہرا خود بھی شاعرہ ہیں۔میرا خیال ہے کہ شاید وہ بڑی شاعری کو بھی تخلیقی تجربے کی کوئی تحقیقی شکل تصور کرتی ہیں اس کے بغیر حرف معتبر کو حرف سرور بنانا مشکل ہے۔محقق اور شاعر پروفیسر سرور صاحب کے مضمون میں ایک فقرہ اس لحاظ سے قابل غور ہے۔

''شاعر چند خوابوں سے حقائق کی توسیع کرتی ہے۔''

اس حوالے سے یہ کہنا آسان ہے کہ تحقیق حقائق کی وسعتوں کو شمار میں لا کر شعور میں لانے کا فن ہے اور یہ وسعتیں شاعری کی کائنات میں بھری پڑی ہیں۔میرے نزدیک تخلیق خواہش ہے اور تحقیق کوشش خواہشیں ناتمام اور کوششیں ناکام بھی ہو سکتی ہیں تب ان میں فرق ہوتا ہے خواہشیں پوری اور کوششیں کامیاب ہو جائیں تو ان میں کچھ فرق نہیں رہتا۔مگر اس بحث میں کچھ ثابت نہیں کرنا چاہتا۔جس طرح خواہش اور کوشش بہر حال ایک دوسرے کی رشتہ دار ہیں۔تخلیق بھی ایک دوسرے کی آئینہ دار ہیں۔

محترمہ زہرا نے شعر و ادب کی ساری جہتوں سے اپنے آپ کو سنوار لیا ہے اور اس سرشاریوں میں انہوں نے ''حرف سرور'' کے ذریعے ہمیں بھی ایک سرور بخش مطالعے میں شریک کیا ہے۔سرور صاحب کی بیشتر تحریریں تخلیقی رنگ لیے ہوئے ہیں۔زہرا بی بی نے

انہیں تحقیق آئینے میں لا کر رنگا رنگ کر دیا ہے۔ یہ بھی محترمہ زہرا ہی کرسکتی تھیں کہ تدوین سے تزئین کا کام لے لیں اور تحقیق کو رفیق بنا دیں۔

محترمہ زہرا ڈاکٹر معین کی رفیق حیات ہیں اور انہوں نے اپنی حیات کے تمام رستوں پر معین صاحب کی ساری رفاقتیں اپنی ہمراز بنالی ہیں۔ پروفیسر سرور صاحب ڈاکٹر معین کی محبوب شخصیتوں میں سے ہیں۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ محترمہ زہرا اپنے محبوب و ممتاز شوہر کی یہ محبت بھی اختیار نہ کرلیتیں۔ وہ لکھتی ہیں۔

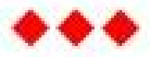
''پروفیسر آل احمد سرور معین صاحب کو بہت عزیز اور محترم رکھتے ہیں اور تکلف برطرف مجھے بھی اس صورت میں زیر نظر کام کو اپنے ہاتھ میں لینے کے لیے کوئی اعتذاز جواز یا سند استحقاق پیش کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

پیش کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔''

اس حوالے سے سرور صاحب کا یہ جملہ بڑا برمحل ہے۔''

''میں معین صاحب کو اپنے ہی خاندان کا ایک فرد سمجھتا ہوں۔''

اسلوب تحقیق میں بھی محترمہ زہرا بی بی معین صاحب سے متاثر ہیں بلکہ ان کے نقش قدم پر چل رہی ہیں۔ ''صرف سرور'' سے پہلے ایک ایسی ہی کتاب ''آپ بیتی رشید احمد صدیقی کے نام سے ڈاکٹر معین الرحمن نے مرتب کی ہے۔ اس کتاب میں تحقیق و تدوین کا جو معیار اور مزاج معین صاحب نے تشکیل دیا ہے۔ اسی کو تھوڑی سی انفرادیت کے ساتھ محترمہ زہرا نے اپنا لیا ہے۔ اپنائیت کے اس پیرائے میں بھی وہ مکمل طور پر سرخرو ہوئی ہیں۔



پنجابی کہانی کی ایک رانی

یہ 1973ء کی بات ہے جب راولپنڈی میں میری ملاقات اعظم خورشید سے ہوئی تھی۔ ان دنوں وہ راولپنڈی وژن پر لوک تماشا کرتا تھا تماشا اور لوک تماشا میں فرق ہے جو میوزک 89 اور بھنگڑے میں ہوتا ہے۔ ہم اکثر رات کو دیر سے پیدل چلتے ہوئے چکلا سے کمیٹی چوک پہنچتے چاند ہمارے سامنے ہوتا اور آہستہ آہستہ وہ ہمارا ہمسفر بن جاتا۔ اعظم کو چاند کی ہمراہی پسند ہے اس نے عبیدہ سے شادی کر لی ہے۔ ہم دونوں کو شانہ اعظم پہنچتے تو ہمیں ایک لڑکی سوئی سوئی ملتی۔ اس کی آنکھوں میں جگراتوں کی مشعل جل رہی ہوتی۔ تب میرے ساتھ اس کے رویے میں اجنبیت اور اپنائیت کا ملا جلا انداز ہوتا جو کم کم کہیں دیکھا۔ ہماری عورتیں لفٹ نہیں کراتیں یا پھر اونچی ایڑی والی لفٹی پہن لیتی ہیں۔

اعظم ایک مختلف آدمی ہے بلکہ اسے ایک مشکل آدمی کہنا چاہیے مگر عبیدہ پچھلے سولہ سال سے اعظم کے ساتھ ایک انوکھی اور شاندار زندگی بسر کر رہی ہے۔ اعظم اپنے آپ میں ڈوبا ہوا آدمی ہے۔ وہ نظر نہ آنے والی بے شمار خوبیوں کا وارث ہے۔ عبیدہ نے نالائق بیویوں کی طرح اسے سطح پر لانے کی کوشش نہیں کی بلکہ ڈبکیاں دے کے اسے بے حال کیا پھر بحال کر دیا۔ اعظم کو مجبوراً تیرنا سیکھنا پڑا ہے۔ وہ دونوں تیرتے تیرتے نجانے کیسے کیسے جزیروں کو دریافت کر آئے ہیں۔ اعظم نے جب کوئی خواب جزیرہ تلاش کیا عبیدہ نے اسے اپنی دھرتی بنا دیا۔ دونوں ٹھیک ٹھاک حیاتی گزار رہے ہیں۔ یہ نہیں کہ ان میں لڑائی کبھی نہیں ہوئی مگر یہ کبھی مرکز اور صوبے کی لڑائی نہیں بنتی جب دو آدمی یہ طے کر لیں کہ ہم نے ایک گھر میں رہنا تو پھر وہ جہاں موجود ہوتے ہیں گھر بن جاتا ہے۔

میں عبیدہ اور اعظم کو دیکھتا ہوں تو مجھے لارنس کی اس بات پر یقین آ جاتا ہے کہ مرد دو دفعہ پیدا ہوتا ہے ایک دفعہ اپنی ماں کے پیٹ سے اور دوسری دفعہ اپنی عورت کے دل سے اور میں حیران ہوں کہ پھر ساس اور بہو کا جھگڑا کس بات پر ہوتا ہے اعظم آسانی سے سمجھ میں آنے والی شے نہیں مگر عبیدہ نے اسے اس کے بھی کئی ایسے رازوں سے آگاہ کیا ہے جو وہ نہیں جانتا تھا۔ عبیدہ نے پنجابی کہانیوں کی اپنی کتاب "پل گھڑی دے دکھ" کا انتساب اعظم کے نام کرتے ہوئے کہا ہے کہ اس نے اعظم سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ کہتے ہیں کہ عورت سیکھنے سے زیادہ سکھانے کی ماہر ہے۔ وہ مرد کو ایسا سبق سکھا سکتی ہے کہ اسے نانی یاد آ جائے نانی بھی عورت ہوتی ہے۔ ویسے سیکھنا اور سکھانا ایک جیسے عمل ہیں۔ مرد عورت کو زندگی دیتا ہے اور عورت مرد کو مگر ہمارا المیہ یہ ہے کہ ہمارے ہاں مرد نے

اپنے اندر عورت کو اور عورت نے اپنے اندر معد کو قتل کر دیا ہے۔ اب یہ جنگ باہر بھی دور دور تک پھیلتی جا رہی ہے۔

اعظم نے بھی اپنی کتاب کا انتساب عبیدہ کے نام کیا ہے۔ اور اسے 1972 کی لڑکی کہا ہے۔

1972 کے ایک سال بعد دونوں کی شادی ہوئی تھی۔ آخر کچھ تو ہے کہ اعظم نے اپنی شادی کے سال کو یاد رکھا ہے۔ ورنہ کسی سے پوچھا جائے کہ شادی کیوں کر رہے ہو تو وہ کہتا ہے کہ اس کے بغیر طلاق نہیں دی جا سکتی۔ اپنے شعری مجموعے میں اعظم نے جو نظم عبیدہ کے بارے میں لکھی ہے وہ ساری کی ساری اپنے بارے میں لکھی ہے اور دوسری بات یہ ہے کہ یہ ایک نثری نظم ہے ہمارے نقاد نثری نظم کو نظم ہی نہیں مانتے پتہ نہیں اعظم کے دل میں کیا ہے۔ عبیدہ بہت سیانی ہے اس نے اعظم کو شاعر اعظم تسلیم کر لیا ہے وہ کچھ کچھ اسم بامسمہ ہے بھی۔

جس طرح بانو آپا نے اشفاق احمد کو اپنے سے بڑا ادیب مان لیا ہے۔ وہ سوچتی رہتی ہیں کہ لوگ نجانے کیوں اشفاق احمد کو ان سے بڑا ادیب نہیں مانتے۔ اب عبیدہ کو بھی یہ فکر لاحق ہونے والی ہے۔ اچھی بیویاں ایسی ہی ہوتی ہیں۔

میں نے کہا کہ عبیدہ کے لیے اعظم نے جو نظم لکھی ہے وہ ساری کی ساری اس کے اپنے بارے میں ہے۔ اعظم عبیدہ کے چہرے میں اپنی شکلیں دیکھتا رہتا ہے کوئی اور عورت ہوتی تو اس آئینے کو چھپا کے رکھتی اور اپنی صورت دیکھ دیکھ کے خوش ہوتی۔ آئینہ عورت کا سب سے جھوٹا گواہ ہے اور جھوٹے گواہ سے بڑا دوست آج کل ہمارا اور کون ہے مگر عبیدہ کسی جھوٹی سچی گواہی کی محتاج نہیں۔ اسنے یہ آئینہ ہی توڑ دیا ہے اور اب آئینوں کا ایک شہر تمثال دار اعظم کے آس پاس ہے وہ جدھر دیکھتا ہے اسے اپنے نظر آتا ہے۔ آئینے کی کرچی جتنی چھوٹی ہو اس میں یہ عکس تو نظر آتا ہے عبیدہ نے بس اتنا اور کیا ہے کہ اس نے اعظم کو یہ باور کرا دیا ہے کہ عکس حقیقت ہے تو جو برعکس ہے وہ بھی حقیقت ہے اب اعظم آئینہ دیکھتا ہے تو اسے اپنے ساتھ عبیدہ بھی نظر آتی ہے۔

اعظم کی نظم سے چند سطریں سنیے۔

یاد رکھو

میری پہچان مجھے ہر موڑ پر دکھائی دے کر میری سیڑھی بنتی ہے

تم سیڑھی نہیں ہو

میرا ارادہ ہو تم

بھول بھلیوں میں الجھ کر نہ رہ جانا

بہت مقامات پر تمہارا دامن اور گریبان چاہیے ہوگا

تمہیں تلاش کروں گا کہ خود کو

بالعموم اس تلاش میں کچھ بھی نہیں ملتا۔ مگر لگتا ہے اعظم کو کچھ نہ کچھ مل گیا ہے عبیدہ مطمئن ہے کہ وہ کسی کو بھی تلاش کرے بے بات ایک ہے۔

عبیدہ کے ساتھ میری ایک رشتہ داری اور بھی ہے ہم دونوں ایک ساتھ گورنمنٹ کالج لاہور میں تھے راوین ہونا ایک برادری ہے مگر یہ برادری ارائیں برادری سے بالکل مختلف ہے۔ عبیدہ نے ان دنوں گورنمنٹ کالج سے اے سائیکالوجی کیا جب صدر شعبہ عالمی شہرت کے دانشور ڈاکٹر اجمل تھے۔ عبیدہ نے گورنمنٹ کالج کا سب سے بڑا اعزاز ''رول آف آنر'' بھی حاصل کیا۔ ویسے آپ کے کان میں بتا دوں کہ یہ اعزاز میں نے بھی حاصل کیا ہے۔ شاید انہیں دنوں اس کی ملاقات اعظم خورشید سے ہوئی تھی۔ وہ لاہور ٹی وی پر تھا تب اعظم کا ملنا جلنا کئی اور لڑکیوں سے بھی ہوگا۔ اس وقت عبیدہ بھی ایک لڑکی تھی۔ مجھے عبیدہ نے بتایا کہ ایک لڑکی نے اسے اعظم کے خلاف بھڑکایا کہ وہ دھوکے باز ہے بے وفا ہے اس نے کئی لڑکیوں کے ساتھ جھوٹے وعدے کر رکھے ہیں۔ تو عبیدہ نے اس لڑکی کو جواب دیا کہ اعظم اس کے ساتھ جھوٹا وعدہ نہیں کر سکتا۔ اللہ یہ یقین دوسری شہری لڑکیوں کو بھی عطا فرمائے۔

اعظم اس کے ساتھ جھوٹا وعدہ نہیں کر سکتا۔ اللہ یہ یقین دوسری شہری لڑکیوں کو بھی عطا فرمائے۔

مگر دلچسپ بات یہ ہے کہ عبیدہ نے اپنی کتاب ''پل گھڑی دے رکھ'' میں شامل تقریباً تمام افسانے مردوں کے جھوٹے وعدوں کا شکار لڑکیوں کے بارے میں لکھے ہیں۔ سب سے زیادہ یہی دکھ عورت کی جھولی میں بھرے ہوئے ہیں عبیدہ نے یہ دکھ اٹھا کر اس کے گلے میں ڈال دیے ہیں۔ یہ مالا پہنے ہوئے عورت اچھی لگتی ہے اصل میں ہم عورت سے ہمدردی کرنے کے عادی ہو گئے ہیں۔ عبیدہ نے اس دلاویزی اور دردمندی سے کہانیاں لکھی ہیں کہ لگتا ہے دکھ سکھ سے زیادہ عورت کے محبوب ہیں۔ دکھی تو ہم بھی مگر پسماندہ ملکوں کے مرد کی عجیب نفسیات بن گئی ہے کہ اسے اداس لڑکی زیادہ پیاری لگتی ہے۔

صدیوں کے اس عمل نے اداسی کی ایک تہذیب کو جنم دیا ہے۔ بے وفائی اور جدائی اور پھر زندگی کیا ہے غم کا دریا ہے' عبیدہ اس دریا کے کنارے بیٹھی ہے اور ریت سے گھر بنایا کرتی ہے۔ ریت کے گھروں اور خوابوں کے محل میں کچھ فرق نہیں۔ پھر یہ بھی ہے کہ گھر کیسا ہی ہو' اس میں کوئی ورت رہنے لگے تو وہ جنت بن جاتا ہے مگر یہ بھی یاد رہے کہ گھر کو دوزخ بنانے کے لیے بھی عورت کی خدمات کچھ زیادہ ہیں۔ اس تضاد کے انبار میں بھی ہم خوش ہیں۔

عورت اور زندگی میں بہت کچھ مشترک ہے کہ آدمی نہ مرنا چاہتا ہے نہ کنوارہ رہنا چاہتا ہے۔ آخر ایسا کیوں ہے کہ آدمی ''عورت جیسی زندگی چاہتے ہیں جو انہیں نہیں ملتی۔ ہماری زندگی کوئی اور بسر کر رہا ہے اور ہم نجانے کس الو کے پٹھے کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔

عبیدہ کی کہانیوں میں سارے مرکزی کردار لڑکیوں کے ہیں۔ یہ ساری کی ساری معصوم لڑکیاں ہیں جو کبھی کبھی بے وقوف لگتی ہیں۔ ایک دم جذباتی اور پینڈو ذرا سی محبت کی بات پر اندھا دھند اعتماد کرتی ہیں اور دھوکے فریب کو قسمت کا تحفہ سمجھ کر سنبھال لیتی ہیں۔ عبیدہ شہر میں رہتی ہے اور اسے دیہاتی مزاج عورتیں اچھی لگتی ہیں۔ اس کی خدمت میں گذارش ہے کہ اچھے مردوں کو بھی شہر میں کمی نہیں۔ کچھ مرد تو عورت کے ہاتھوں مظلوم بھی ہیں۔ عبیدہ سادگی اور تازگی کو عورت کا اصل جوہر سمجھتی ہے۔ وہ خود بھی سادہ ہے مگر سادگی کو اپنی طاقت بنانے کا فن جانتی ہے۔ کاش اس کے افسانوں میں کوئی اس کے اپنے جیسی لڑکی بھی ہوتی۔ میرا خیال ہے اس کی کہانی اعظم لکھے گا۔ مگر مجھے یہ ڈر ہے کہ کہیں پھر وہ اپنی کہانی نہ لکھ دے۔ یہ عبیدہ کی کہانی بھی ہوگی۔ ہماری کہانیاں ایک جیسی کب ہوں گی تو زندگی چمک اٹھے گی مگر ایسا کبھی ہوا نہیں ہر شخص کی الگ الگ زندگی ہے اس زندگی میں کتنی زندگیاں ہیں عبیدہ کی پنجابی کہانیاں پڑھتے ہوئے مجھے پنجابی کی ایک بولی یاد آئی۔

تیرے سامنے بیٹھ کر رونا تے دکھ تینوں نہیں دسنا۔

ان لڑکیوں کے دکھ جمع کر کے عبیدہ نے بیان کر دئے ہیں۔ دکھ بیان کرنے سے کم تو نہیں ہوتے بس اپنے بن جاتے ہیں عبیدہ نے دکھوں کو دوست بنا دیا ہے۔ وہ عورت کے مستقبل کے لیے پر امید ہے اور یہ مرد سے کوئی مختلف مستقبل نہیں عبیدہ نے آزادی نسواں کی لیڈر بن کر اپنی سیاست نہیں چمکائی۔ ہماری کچھ انقلابی عورتیں کہتی ہیں کہ جب تک عورت پوری طرح مادر پدر آزاد نہ ہو جائے تو مزا ہی نہیں آتا۔ وہ جتنی ترقی یافتہ ہوتی چلی جاتی ہیں میک اپ کرنے میں اتنی ہی زیادہ دیر لگانے لگتی ہیں۔

اس تمام بیان سے میرا مطلب خدانخواستہ یہ ہرگز نہیں کہ عبیدہ کوئی مولوی صاحبہ ہے۔ وہ تنگ نظر نہیں شائستگی شگفتگی اور کشادگی کا ایک خوبصورت امتزاج اس کی ذات میں سمٹ آیا ہے۔ وہ مسکراتے ہوئے وقار کا ایک مجسمہ ہے اسے مل کر محسوس ہوتا ہے کہ وہ تو ہماری دوست ہے۔ سچی عورت فطری طور پر دوست ہوتی ہے اور دوستی ایک باوقار رشتہ ہے۔ کچھ عورتوں نے تصنع اور تکلف کی دیواریں اپنے اردگرد کھڑی کر رکھی ہوتی ہیں کچھ لڑکیاں ایسی ہوتی ہیں کہ ان کے ماتھے پر لکھا ہوتا ہے۔ اندر آنا منع ہے۔ ان سے ملنے کے لیے چپڑاسی کو اعتماد میں لینا پڑتا ہے مگر عبیدہ ان عورتوں میں سے ہے کہ اس سے بات کرنے کے لیے اس سے نہیں اپنے آپ سے اجازت لینا پڑتی ہے۔ ہمارے ہاں دو طرح کی عورتیں ملتی ہیں مغربی عورتیں مشرقی عورتیں عبیدہ نے اپنی زندگی میں مشرق و مغرب کو اکٹھا کر

دیا ہے۔ساری سمتیں ہماری ہیں مثلاً ہمارے ہاں یہ بات بھی معیوب ہے کہ عورت کے لیے دوست کا لفظ استعمال کیا جائے اور آشنا کا لفظ تو بہت برا ہے۔اس کے حوالے سے غلط غلط خبریں شائع ہوتی رہتی ہیں ہم عورت کو عورت سمجھتے ہیں آدمی نہیں سمجھتے اس میں عورت بھی برابر کی شریک ہے۔پرانے زمانے میں غالباً عباسیوں کے دور حکومت میں ایک عورت نے نبوت کا دعویٰ کر دیا تو اسے یہ حدیث سنائی گئی۔

''حضرت رسول کریم نے فرمایا میرے بعد نبی نہیں آئے گا۔''

اس عورت نے کہا۔

''میں منکر حدیث نہیں۔یہ حدیث بالکل ٹھیک ہے کہ حضور نے فرمایا ہے کہ میرے بعد نبی نہیں آئے گا مگر انہوں نے یہ نہیں کہا کہ میرے بعد نبیہ نہیں آئے گی۔سو میں آ گئی ہوں۔''

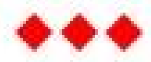
ہماری عورت بالعموم سامنے آنے کے لیے یہی تکنیک استعمال کرتی ہے۔پستول حاصل کرنا ہو تو توپ کے لائسنس کے لیے جلوس نکالتی ہیں بلکہ چڑیا مارنے کے لیے توپ کا استعمال کرتی ہیں۔عبیدہ کو کچھ افسانے اس حوالے سے لکھنے چاہیں جو اس عورت کے کردار وحالات کی مکمل عکاسی کرتے ہوں۔

عبیدہ ریڈیو پر نوکری کرتی ہے اور نماز بھی پڑھتی ہے۔یہ دونوں کام ایک ساتھ کیسے ممکن ہیں۔یہی بات لوگوں اور عورتوں کی سمجھ میں نہیں آتی۔عبیدہ مسجد میں نماز نہیں پڑھ سکتی اور ریڈیو پر نماز پڑھنے کے لیے جگہ تلاش کرتی رہتی ہے جس طرح مرغی انڈہ دینے کے لیے کسی محفوظ جگہ کو تلاش کرتی ہے۔یہ بات ممتاز مفتی نے بانو آپا کے لیے لکھی ہے کہ وہ کہانی لکھنے کے لیے گھر میں کوئی خفیہ جگہ ڈھونڈتی ہیں۔یعنی نماز پڑھنے اور کہانی لکھنے میں بہت کچھ ایک جیسا ہے۔میرے رسول نے کہا مجھے تین چیزیں پسند ہیں...... عورت، خوشبو اور نماز۔ان تینوں چیزوں میں کئی چیزیں ایک جیسی ہیں۔بانو آپ کا ذکر اس لیے آیا کہ انہوں نے بھی اشفاق احمد خان کے ساتھ ایسا ہی سلوک کیا ہے جیسا عبیدہ نے اعظم کے ساتھ سلوک کر رکھا ہے اشفاق احمد خان صوفی دانشور ہے مگر ایک پٹھان کتنا صوفی ہو سکتا ہے۔

بانو آپا اشفاق احمد سے محبت کرتی ہیں اور ان کی عزت بھی کرتی ہیں کچھ عورتوں یا مردوں کے خیال میں ایک دوسرے کی عزت کرنے سے محبت خطرے میں پڑ جاتی ہے۔شاید اسی لیے ہماری مشترکہ زندگیوں میں خطرے کی تلوار مسلسل لٹکتی رہتی ہے عبیدہ بھی اس بات کو محسوس کرتی ہے کہ اس کے نام کے ساتھ اعظم کا اضافہ خورشید کی وجہ سے ہوا ہے ورنہ تاریخ میں اعظم کا لاحقہ اب تک صرف

مردوں کے قبضے میں ہے۔ سکندر اعظم سے قائد اعظم تک ایک بات یہ بھی غور طلب ہے کہ ادبی زندگی کے لیے عبیدہ نے اعظم سے مختلف راستہ اختیار کیا ہے۔ اعظم اردو میں شاعری کرتا ہے عبیدہ پنجابی میں کہانی لکھتی ہے مگر عبیدہ اپنی عظمت کے ساتھ مل کر ڈھونڈنے نکلی ہے اور وہ یقیناً کامیاب ہوگی۔ البتہ مردوں کو یہ مان لینا چاہیے کہ عورت کی ایک اپنی ذات بھی ہے ورنہ کوئی محترمہ وزیر بیگم اگر کسی اعظم نامی سے شادی کرے تو وہ وزیر اعظم نہیں بن جائے گی۔

آخری بات عبیدہ کی کہانیوں کے سلسلے میں یہ ہے کہ اس نے عورتوں کے آنسوؤں کو اپنی کہانیوں میں جمع کیا ہے۔ وہ کچھ ایسی کہانیاں بھی لکھے جن میں عورتوں کے قہقہے کو جمع کیا گیا ہو کہ عورت ہنستی ہوئی بھی اچھی لگتی ہے۔



دیکھ کبیرا ہسیا

ہماری لوک تاریخ کا ایک کردار ہے بھگت کبیر جسے لوگ کبیرا کبیرا کہتے ہیں وہ ہر وقت روتا رہتا تھا۔دیکھ کبیرا رویا۔نجانے اس نے کیا دیکھ لیا تھا۔شاید اشفاق احمد کے ڈرامے سے ملتا جلتا کوئی کھیل غور سے دیکھ لیا ہوگا۔اب ہمارے مزاحیہ ادب میں یہ کردار پھر نمودار ہے۔محمد کبیر خان یعنی دیکھ کبیرا ہسیا نجانے اس نے کیا دیکھ لیا ہے۔اس نے بھی یقناً اشفاق احمد کا کوئی ڈرامہ دیکھا ہوگا۔دونوں کام ایک جیسے ہیں۔آدمی ہنستے ہنستے بھی تو رو پڑتا ہے۔اشفاق احمد ایک منفرد ڈرامہ نگار ہے اس دنیا میں اب ہم ہنسنے کی عادت بھولتے جارہے ہیں اور ہم رونے کی روات بھی بھولتے جارہے ہیں۔ہم ساری اچھی عادتیں گنواتے جارہے ہیں۔جو شخص ہمیں رلادے جو ہمیں ہنسادے ہمارا محسن ہے میں دونوں کبیروں کا شکریہ ادا کرا ہوں پانے یار محمد کبیر خان میں یہ دونوں کبیرے چھپ کر بیٹھے ہوئے ہیں کبیر خان کی کتاب ہمہ یاراں دشت یار بیبیوں کی بڑی بڑی محرومیوں اور چھوٹی چھوٹی خوشیوں کا ایک ڈھیر ہے۔اس کے بیان میں ایک لذت ہوتی ہے۔درد کی کسک کے بغیر اعلیٰ مزاح تخلیق نہیں ہوسکتا کبیر خان جہاں بھی ہوتا ہے یار بیبیوں کا مجمع لگا لیتا ہے۔اس میں دشت وصحرا اور کوہستانوں کی تخصیص نہیں۔

کبیر خان بلاشبہ ایک اعلیٰ پائے کا مزاح نگار ہے۔ایک خاموش اور مخلص کشمیری پٹھان کا مزاح نگار ہونا ایک انکشاف سے کم نہیں۔اس لحاظ سے یہ ایک دلچسپ حقیقت ہے یہ حقیقت جب دلچسپ ہوتی تو مزاح بن جاتی ہے۔کبیر خان نے اپنی کتاب کو مختلف رنگوں کا سلسلہ بنادیا ہے اپنے وطنم یں اور وطنسے دور جو کچھ اس نے لکھا۔اسے ایک ساتھ جمع کردیا ہے۔اس طرح ایک ورائٹی پیدا ہوگئی ہے فنکاری یہ ہے کہ تھوڑی سی ورائٹی سے اچھا خاصا ورائٹی شو بنا لیا جائے۔دشت وصحرا کی وسعتوں میں اپنی بیوی بچوں کا مقدر بدلنے کے لیے صعوبتیں برداشت کرنا آسان نہیں۔اس طرح بچوں کا مستقبل تو شاید بن جائے بیوی کا حال پورے کا پورا سنوار لینا ناممکن ہے۔

یہ ایک پوری زندگی کا نقشہ ہے اس زندگی کا احوال بیان کرتے ہوئے پھلجڑیاں چھوڑتے چلے جانا صحرا میں گل وگلزار کھلا دینے کا عمل ہے۔حس مزاح بیابانوں میں بہاروں کی نوید کی طرح ہے۔ہماری زندگی بھی اب ہماری دشمن ہوتی جارہی ہے۔اس دوڑ میں دھوئیں اور دھول کے طوفانوں کے درمیان قہقہوں کی برسات لے آنا صرف نیکی نہیں جہاد بھی ہے ہمہ یاراں دشت میں اس جہاد کو کبیر خان مجاہد اکبر کے درجے پر پہنچا دیا ہے۔وہ اس ضمن میں افغان مجاہدن سے بھی بازی لے گیا ہے۔افغان مجاہدین میدان جنگ میں

اس طرح جاتے ہیں جس طرح ہمارے لوگ دولت کمانے دوبئی جاتے ہیں۔شاید اس لیے ایک سپر پاور ڈر کے مارے وہاں سے بھاگ کھڑی ہوئی ہے۔نجانے دوسری سپر پاور فلسطین سے کب نکلے گی۔یہ خبریں مزاحیہ اطلاعات لگتی ہیں۔ان میں سے ایک افغان مجاہدین نے ممکن کر دکھائی ہے خطرہ ہے کہ ہمارے مزدوروں کی جانفشانیوں سے گھبرا کر عرب امرا بھاگ کر پاکستان نہ آ جائیں۔وہ یہاں آئے تو ہم انہیں مقبوضہ کشمیر بھیج دیں گے مسئلہ کشمیر افغانستان اور فلسطین سے کم اہم نہیں ہے۔

جیسا کہ نام سے ظاہر ہے یہ کتاب زیادہ تر اہل دشت کی کہانی ہے دشت اور دریا مسلمانوں کی بڑی پرانی جولانگاہ ہے صحرا اور سمندر دونوں ہمیشہ ہماری زد میں رہے۔پہلے مسلمانوں فتوحات کے ڈھیر لگانے کے لیے گھروں سے نکلتے تھے۔اب دولت کے ڈھیر لگانے کے لیے نکلتے ہیں۔

دشت تو دشت ہیں دریا بھی نہ چھوڑے ہم نے
بحر ظلمات میں دوڑا دیئے گھوڑے ہم نے

آج ہم ہوائی جہاز پر بیٹھتے ہوئے وہی دعا پڑھتے ہیں جو ہمارے آباؤاجداد گھوڑے پر بیٹھتے ہوئے پڑھتے تھے۔اس طرح ہم طیاروں کو گھوڑوں میں بدل لیتے ہیں۔کون کہتا ہے کہ جذبوں کی اہمیت ہتھیاروں سے کم تر ہے۔بس ارادے کی کمی ہے اور چیلنج سامنے نہیں ہے۔بات چیلنج کی آئی ہے تو کبیر خان کی اس بات پر غور کریں کہ دیار غیر میں لوگ نماز روزے کے پابند ہو جاتے ہیں۔حالانکہ صرف نماز کے لیے اتنا لمبا سفر کرنا مخول کرنے کے مترادف ہے ویسے ہماری یہ بات اچھی ہے کہ ہم نیکیاں کمانے اور روپے کمانے کو ایک جیسا عمل سمجھتے ہیں۔ہمارے بڑے نوٹوں پر لکھا ہوتا ہے کہ رزق حلال کمانا عین عبادت ہے ہم نے اس شوق میں حرام حلال کی تمیز ختم کر دی ہے اور اب دن رات عبادت میں مصروف رہتے ہیں۔

کبیر خان کے شہر کا نام راولا کوٹ ہے جسے منی سری نگر کہتے ہیں۔ہمارے حصے میں سری نگر بھی ایسا ہی آیا ہے جیسا کشمیر آیا ہے جسے ہم نے آزاد کشمیر کا نام دیا ہے جو کچھ دوستوں کے خیال میں نہ آزاد ہے۔نہ کشمیر آزاد کشمیریوں کا دکھ دیکھیں۔کہ اپنی زمین پر رہتے ہوئے کس درد سے اپنا قومی نغمہ گاتے ہیں۔مرے وطن تری جنت میں آئیں گے اک دن کبیر خان بہشت میں جانے کی بجائے دشت میں چلا گیا ہے۔شاید اسی لیے مزاح نگار ہو گیا ہے۔وہ فطری طور پر مزاح کی طرف مہربان ہے جس طرح کشمیر کے پہاڑوں سے پانی کے چشمے پھوٹتے ہیں وادی کشمیر کو جنت نظیر کہتے ہیں تو اس حساب سے آزاد کشمیر مقام اعراف ہوا۔اور میرے خیال میں مزاح لکھنے کے لیے سب سے موزوں جگہ یہی اعراف ہے جنت میں تو صرف عیش ہوتے ہیں جو اہل عیش ہیں اور اہل طیش ہیں زیادہ تر حسن ظرافت سے خالی ہوتے ہیں۔کبیر خان اچھا مزاح نگار ہے کہ نہ اس کو غصہ آتا ہے اور نہ وہ عیش وعشرت کا دلدادہ ہے۔اس اعتبار

سے ہمہ یاراں دشت کا نام ہمہ یاراں اور اعراف ہوتا تو بھی ٹھیک تھا۔ ویسے ہمہ یاراں دوزخ کے نام سے ایک کتاب پہلے شائع ہو چکی ہے جو بھارت میں پاکستان جنگی قیدیوں کے احوال پر مبنی ہے۔

صدیق سالک اس کے مصنف ہیں۔ اس کتاب میں بھی مزاح کی خنکی موجود ہے ثابت ہوا کہ چار یار اکٹھے ہوں اور واقعی ایک دوسرے کے یار ہیں تو دوزخ بھی اتنا دوزخ نہیں رہتا۔ شاید اس کتاب کی برکت تھی کہ اب صدیق سالک ہمہ یاراں بہشت کا بھی خاصا لمبا تجربہ اس دنیا میں لوٹ چکا ہے مگر وہ اس نام سے کتاب کبھی نہ لکھتا۔ کہ یہ کتاب نہ ہوتی اس کے یاروں اور افسروں کے بارے میں وائٹ پیپر ہوتا۔

ہمہ یاراں دشت سے پتہ چلا کہ مسافرت میں مزدوری بھی قید بامشقت ہے۔ وطن سے اتنی دوران مزدور مسافروں کی حیثیت بھی جنگی قیدی سے مختلف نہیں۔ یہ جنگی قیدی اپنے آنگن میں اور اپنے باطن میں کسی کے ساتھ لڑائی کرتے ہوئے ہتھیار ڈال کر قید ہیں۔ خیر یہ تو جملہ معترضہ ہے ایک بات پکی ہے کہ چار پانچ دوست کہیں بھی ہوں اور ایک دوسرے سے ہمدردی رکھتے ہوں تو گزارا ہو جاتا ہے کبیر خان جیسا یار بے بدل ہو تو اچھی طرح گزارا ہو جاتا ہے کشمیر اور پنجاب کے ایک مشترکہ شاعر میاں محمد سے کبیر خان خاصا متاثر لگتا ہے۔

یاراں نال بہاراں سجناں بن یاراں کس کاری
یار ملن دکھ کٹے جاون فضل کرے رب باری

یاری دوستی کے معاملے میں کبیر خان حضرت علی کے اس قول کو دل سے تسلیم کرتا ہے کہ دوست تین قسم کے ہوتے ہیں ایک آپ کا دوست دوسرا آپ کے دوست کا دوست تیسرا آپ کے دشمن کا دشمن۔ البتہ یہ جو تیسرے قسم کا دوست ہے اسکا تجربہ کبیر خان کو اتنا نہیں۔ مختلف گروہوں کے نقادوں کو بہت زیادہ ہے۔ کبیر خان کی کتاب کا انتساب اس لحاظ سے قابل غور ہے "عطاء الحق قاسمی اور اس کے دوستوں کے نام۔"

کبیر خان کوہستان میں پیدا ہوا اور جوانی صحراؤں میں گزار دی۔ وہ فطرت کے سارے مظاہر اور مناظر کو اپنی ذات میں جمع کرنا چاہتا ہے۔ اس خواہش نے اسے اعلیٰ اوصاف سے نوازا ہے۔ گہرا خاموش اور فراغ دل اسے بندہ صحرائی بھی کہا جا سکتا ہے اور مرد کہانی بھی مگر اس کو اقبال کا یہ شعر کبھی سمجھ نہیں آیا۔

فطرت کے مقاصد کی کرتا ہے نگہبانی
یا بندہ صحرائی یا مرد کہستانی

بات یہ ہے کہ ہمارے یعنی کبیر خان کے مقاصد ذرا بدل گئے ہیں جنھیں یہاں بیان کرنا مناسب نہیں۔ بس یوں سمجھ لیں کہ یہ مقاصد اقبال والے ہرگز نہیں ہیں۔ کبیر خان کشمیر خاں کا سگا بیٹا ہے پٹھان اوپر سے کشمیری یک نہ شد دو شد۔ اس کی کتاب میں جگہ جگہ کشمیری زبان و ثقافت کی جھلکیاں ملتی ہیں تا کہ ثابت کیا جا سکے کہ وہ کشمیری ہے مگر وہ ابھی تک یہ ثابت کرنے سے ہچکچاتا ہے کہ وہ پٹھان بھی ہے پتہ نہیں مزاج اس نے کیا ثابت کرنے کے لیے لکھا ہے۔ میرا خیال ہے کہ بے خبری ہیں وہ اتنی اعلیٰ اتنی عمدہ تحریر لکھ گیا ہے مزاح نگار بچے کی طرح ہوتا ہے۔ معصوم ذہین اور سادہ اس کی عام سی حرکتوں اور توتلی باتوں پر بلا وجہ ہنسی آ جاتی ہے اور دل میں گدگدی ہونے لگتی ہے۔ جب کوئی ادیب زور لگا کر لکھتا ہے تو پھر اس کا لکھا ہوا مزاحیہ کب ہوتا ہے۔ انشائیہ بن جاتا ہے۔ انشائیہ تصنع ہی تصنع ہے مزاحیہ ترفع ہی ترفع ہے۔

ہمہ یاراں وشت دراصل ایسی کتاب ہے جس میں سفرنگاری اور خاکہ نگاری آپس میں گھل مل گئی ہیں۔ اپنی زمین سے اتنی دور اڑتی ہوئی ریت کے طوفانوں میں دوستوں کی مٹھی میں خاک تلاش کر لینا کبیر خان ہی کا کام ہے۔ وہ جب کسی دوست کا خاکہ تحریر کرتا ہے تو اس کے لفظوں سے اپنی دیس کی مٹی کی خوشبو آتی ہے۔ عطاء الحق قاسمی نے کتاب کے دیباچے میں لکھا ہے کہ کبیر خان اپنے دوستوں کا ذکراتی آسودگی اور بے تکلفی سے کرتا ہے کہ وہ سب مجھے اپنے بہت قریبی دوست محسوس ہوتے ہیں۔ یہ کبیر خان کی درد مندانہ محبت کا اعجاز ہے ورنہ ہمارے خاکہ نگار جس دوست کے بارے میں لکھتے ہیں وہ ان کا دشمن نمبر ایک بن جاتا ہے۔

جہاں کبیر خان کے ہاں سفر کا احوال ابھرتا ہے تو ساری دقتیں خوش طبعی میں آہستہ آہستہ ضم ہونے لگتی ہیں۔ سفرنامے میں شگفتگی اور کشادگی کی روایت بہت پرانی ہے کہیں کہیں پر فلسفہ تہذیب مسکراتی آتی ہے۔ اختر ریاض الدین اور اشفاق احمد اس کی نمائندہ مثالیں ہیں۔ سفرنامے میں باقاعدہ مزاح کا تڑکا لگانا ابن انشاء اور عطاء الحق قاسمی نے شروع کیا اور کبیر خان ٹھہرا عطاء کا یار اس نے طنز و مزاح کے حوالے سے عطاء کی بہت سی عادتیں اپنانے کی کوشش کی ہے طرز تحریر البتہ کبیر خان کا اپنا ہے فرق اتنا ہے کہ کبیر خان کشمیر سے آیا ہو مسافر ہے اور عطا کشمیر سے آیا ہوا اور مہاجر ہے اور ہمارے ہاں مہاجروں کی واپسی کی کوئی روایت نہیں ہے۔ ویسے کبیر خان اور عطاء الحق قاسمی کے کچھ ملکی لوگوں کے بارے میں اور کچھ غیر ملکی نازنینوں کے بارے میں خیالات ملتے جلتے ہیں۔ جذبات ذرا ذرا مختلف ہیں ارادے تو بالکل ہی مختلف ہیں۔ کبیر خان گناہ کبیرہ کے قریب نہیں پھٹکتا اور عطاء الحق قاسمی گناہ صغیرہ کے قریب نہیں پھٹکتا۔

◆◆◆

بنگلہ دیش میں پاکستانی افسانہ

شام بار کپوڑی اولڈ راوین ہے انہی دنوں میں تھا گورنمنٹ کالج لاہور میں' جب میں بھی تھا تب وہ پاکستانی تھا' اب بنگلہ دیشی ہے۔ ان دنوں ہمارا ایک مشترکہ دوست مشرقی پاکستانی تھا اسے سیاست میں حصہ لینے کا شوق تھا۔ بہت شوق ہوا تو وہ فوج میں بھرتی ہوگیا۔ نجانے کب وہ مارشل لا لگائے گا۔ پاکستانی فوج سے رہائی ملی تو اسی کا نام بنگلہ دیشی فوج رکھ لیا۔ اور اس کی حکومت کو قبول کرلیا۔ اس فوج میں ابھی اتنے لوگ ہیں جو پاکستان آرمی میں تھے کہ کئی سال تک بنگلہ دیش میں اپنی حکومت قائم رکھ سکتے ہیں۔ کسی نہ کسی طرح پاکستانی فوج بنگلہ دیش پر حکمرانی کررہی ہے میں سوچتا ہوں کہ پھر بنگلہ بندھو تحریک کے تکلف سے کیا فائدہ ہوا ہمارے بھائی خواہ مخواہ بھارت کے بہلاوے میں آگے بندھو نڑے بدھو نکلے۔

شام بار کپوری کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ''پدما کی موجیں'' کے نام سے شائع ہوا ہے اسے بنگلہ دیش کے اردو افسانوں کا پہلا مجموعہ کہا گیا ہے مگر اس کے آغاز میں لکھا ہوا ہے کہ یہ افسانے 1957ء سے 1966ء تک لکھے گئے افسانے ہیں یعنی جب یہ افسانے لکھے گئے تو افسانہ نگار مشرقی پاکستانی تھا۔ البتہ یہ کتاب 1979ء میں چھپی۔ اس طرح تو بنگلہ دیش میں چھپنے والی کتاب میں شامل افسانے مشرقی پاکستان میں لکھے گئے تھے۔ یہ کتاب پاکستانی ادب میں شمار نہیں ہوسکتی۔ تخلیقی سطح پر یہ بنگلہ دیش میں پاکستان کی ایک یاد کی طرح ظاہر ہوتی ہے۔ شام کے تین اور مجموعے ''میگھنا کی لہریں'' ''جمنا کے دھارے اور'' سورج مکھی'' شائع ہوچکے ہیں۔ ان کتابوں میں شامل افسانوں میں پاکستان کے کئی رنگ چمکتے نظر آتے ہیں۔ شام کے تیسرے مجموعے ''جمنا کے دھارے'' میں کئی افسانے اجنبی جزیرے کا مسافر آٹھ کروڑ کا زخم سانپ سناٹے کی چیخ وغیرہ ایسے افسانے ہیں جن میں پاکستان کے بچھڑنے کا دکھ کا ذکر ہے۔ پچھتاوا بھی ہے۔ آہستہ آہستہ اپنے لیڈروں کے کیے کا افسوس جاگ رہا ہے۔ ضروری تو نہیں کہ زمین کا نام بدلنے سے زمانہ بھی بدل جائے۔ غریبوں کے دکھوں میں کمی نہیں ہوئی۔ ان سے کہا گیا تھا کہ مشرقی پاکستان کا نام بنگلہ دیش پڑتے ہی زندگی بدل جائے گی۔ غربت وغلامی ختم ہوجائے گی۔ ہوا صرف یہ کہ حکومت کرنے والوں کے نام بدل گئے محکوموں کے تو نام بھی نہ بدلے۔ سر جھکا کچھ سہہ جانے کے علاوہ ابھی وہ کچھ کرنے کے قابل نہیں ہیں۔ پاکستان بہرحال ان کا اپنا ملک تھا۔ اب تو وہ بھارت کے قیدی ہیں شام بار کپوری کی کتاب ''جمنا کے دھارے'' میں ایک افسانہ ہے آٹھ کروڑ کا زخم ایک اقتباس درج ذیل ہے۔

''جب 16 دسمبر کو آزادی ملی تو وہ بھی اپنے گاؤں آیا۔ بیوی بچوں سے مل کر خوشی کے مارے اس کی آنکھوں سے پدما اور میگھنا کے دھارے بہہ نکلے۔ ایک بچہ اس ہنگامہ میں لقمہ اجل ہو چکا تھا۔ بیوی کی اس دلجوئی پر کہ اب زندگی کا سورج چمکنے والا ہے۔ اے ڈھارس بندھی ہمارا اپنا ملک اپنی حکومت ہے پاکستانیوں کو ملک بدر کر دیا گیا۔ اب غم کی گھٹا چھٹ جائے گی لیکن اس کے برعکس رمضان شیخ کی زندگی میں ہر آنے والا دن ایک نیا زخم لے کر آتا چند ہی دنوں میں چ اول جو پاکستان کے زمانے میں بیس روپے من ملتا تھا۔ اسی روپے پھر ڈیڑھ سو روپے یہاں تک کہ چار سو روپے من تک فروخت ہونے لگا تن ڈھانکنے کو جب کپڑا نہیں ملنے لگا تو مچھلی پکڑنے کا جال ستر پوشی کے کام آنے لگا ضروریات زندگی کی چیزیں عنقا ہو گئیں پھر انہیں ملا کیا ایک نیا بابائے قوم اور دوسرا اپنا قومی پرچم۔ لیکن زندہ رہنے کے لیے کچھ بھی نہیں ملا۔ یہاں تک کہ پینے کے پانی کو بھی آدمی ترسنے لگا جن لوگوں کی زندگی پدما سے وابستہ ہو اگر انہیں پانی نہ ملے تو اس سے بڑی بدنصیبی اور کیا ہوسکتی ہے زندگی یوں ہی مصیبت اور تکلیف سے گزر رہی تھی۔ جن پر پڑوسی ملک نے ایک اور بھرپور زخم لگایا۔ پدما جس پر انہیں بڑا ناز تھا فرخا بند کی وجہ سے اس کا پانی بند ہو گیا جس دریا میں زندگی کی کشتی رواں دواں تھی۔ آج وہ کشتی ٹوٹے ہوئے بادبان کے ساتھ ریت میں پھنسی ہوئی تھی۔

بنگلہ دیش والوں نے اپنے بابائے قوم کو قتل کرنے کے لیے زیادہ انتظار نہ کیا یہ بھی ایک واضح ردعمل ہے بنگلہ دیشی ردعمل میں بس سو رہے ہیں۔ اپنی قیادت سے کسی فیصلہ کن عمل کا مطالبہ شام بارکپوری کے شریفانہ احتجاج میں بھی سنائی دیتا ہے۔ وہ خود اپنی تحریروں میں عمل اور ردعمل کے درمیان پھنسا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ رہا بنگلہ دیش کا قومی پرچم تو وہ اب بھی لہولہان ہے پاکستان کے پرچم پر بھی اسی لہو کے چھینٹے ہیں مولوی فرید احمد اور لاکھوں لوگوں نے اسی پرچم کو اپنا کفن بنا لیا۔

میرے دل میں ایک خواہش سر اٹھاتی ہے کہ اگر علیحدگی ایک طے شدہ تاریخی امر تھی تو پھر اس ملک کا نام مشرقی پاکستان ہی ہوتا تو کیا حرج تھا۔ مغربی پاکستان کے خلاف غبار بنگلہ دیش کی دھندلی فضاؤں میں تحلیل ہوتا جا رہا ہے۔ مغربی پاکستان بھی پاکستان بن کر بنگلہ دیش کو قبول کر چکا ہے تو پھر دشمن جذبوں کی زد میں آ کر ایک بدنصیبی کو بدنامی کی شکل ہی کیوں دے دی گئی۔ چند سازشی لوگ تھے بھارت کے ایجنٹ دونوں طرف جنھوں نے مثبت تاریخی عمل کو ایک منفی سیاسی رنگ دے دیا۔ پاکستان میں بنگلہ دیش کی تحریک چلوائی گئی۔ یہ کیا مذاق ہے کہ بنگلہ دیش میں مغربی بنگال شامل نہیں وقت آنے والا ہے کہ پورے بنگال میں تحریک پاکستان پھر چلے گی۔ بنگلہدیش کا قیام کسی طور قیام پاکستان کے مماثل نہیں۔ بھارتیوں اور پاکستانیوں میں چالیس برس بعد بھی دشمنی کی صورت جوں کی توں ہے۔ دونوں ملک دل سے ایک دوسرے کو تسلیم کرنے والے نہیں۔ ایک عمومی مثال یہ ہے کہ پاکستا اور بھارت میں کرکٹ کا میچ بھی ہو

تو جیسے دونوں ملکوں میں جنگ چھڑ گئی ہو اور یہ میچ ڈھاکہ میں کھیلا جا رہا ہو تو بنگلہ دیش پاکستان کی حمایت میں نعرے لگانے لگتے ہیں۔ لگتا ہے مشرقی بنگال والے ایک بار پھر علیحدہ ہوئے ہوں ہندوستان سے۔ بنگلہ دیش اور پاکستان تو دو برادر ملک ہو گئے ہیں۔ اس علیحدگی سے کدورتیں گویا چھٹ گئی ہیں بنگلہ دیش نے جب تلخی کا اظہار کیا تو بھارت کے خلاف کیا۔ ان پر یہ حقیقت کھل گئی ہے کہ انہیں اپنا زیر نگیں کون ملک بنانا چاہتا ہے۔

بیرونی فوجی مداخلت کے نتیجے میں معصوم خون کا ایک قطرہ بھی زمین پر گرا تو پاکستان کا نقشہ بنا گیا۔ ایک سچے بنگلہ دیشی شام بارکپوری کے لفظوں میں مجھے اسی لہو کی خوشبو نظر آتی ہے نئے دلوں کے زخموں میں اسے پرانے دکھوں کی ٹیس اٹھتی محسوس ہوتی ہے بنگلہ زبان کے لیے ہونے والے فسادات کے میدان میں بنے ہوئے ملک میں رہتے ہوئے بھی وہ اردو میں لکھتا ہے بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناح نے ڈھاکے کے پلٹن میدان میں کھڑے ہو کر کہا تھا کہ پاکستان کی زبان اردو ہو گی۔ جن لوگوں نے ون یونٹ توڑا اور پاکستان کی دو قومی زبانیں بنا دیں پہلا ظلم انہوں نے کیا۔ ورنہ صوبوں کی زبانوں کو پاکستان زبانیں قرار دے کر اردو کو کسی رکاوٹ کے بغیر قومی زبان کا درجہ دیا جا سکتا تھا۔ کالے صاحبوں اور انگریز گماشتوں نے انگریزی کی پناہ میں وطن کو تباہ کر دیا ہے۔ دوسرا ظلم ان لوگوں نے کیا جو اردو کے وارث ٹھہرے ہوئے ہیں انہوں نے پاکستان کی زبانوں کو سوچے سمجھے منصوبے کے تحت نظر انداز کیا۔ اور ایک درست ماحول کو غیر فضا میں بدل دیا۔ اس ضمن میں افسر شاہی اور ذرائع ابلاغ کے کئی با اثر افسروں کے علمی اداروں اور یونیورسٹی کے لوگوں نے بھی بڑا غلط کردار ادا کیا۔

پاکستان میں کئی لکھنے والوں کی تحریروں میں اردو کے کچھ نالائق اور سازشی پروفیسر غلطیاں نکال کے خوش ہوتے ہیں۔ انہیں سندھی پنجابی بلوچی اور پٹھانی لہجے میں اردو بولنے پر اب بھی غصہ آتا ہے۔ وہ پی ٹی وی کے اردو ڈراموں کے بھی خلاف ہیں کہ ہمارے بچوں کی زبان خراب ہوتی ہے۔ ان کے اس رویے نے ملک کا خانہ خراب کر دیا ہے کسی چینی کو اردو بولتے ہوئے سن کر خوش ہونا چاہیے منہ نہیں بسورنا چاہیے قائداعظم نے انگریزی زبان میں اعلان کیا تھا کہ پاکستان کی زبان اردو ہے۔ قائداعظم کے سارے اعلانات اب صرف کتابوں کی زینت ہیں ہندو اب بھی اردو کو مسلمانوں کی زبان کہتے ہیں اور پاکستان کو ''اردو سٹیٹ'' مشرقی پاکستان میں لوگ اردو سمجھتے تھے بولتے بھی تھے پہلے انہیں اردو کے خلاف کیا گیا اور بات پاکستان کے بگاڑ تک پہنچی۔

اب بنگلہ دیش میں شام بارکپوری ''اردو سٹیٹ'' کا پہلا سفیر ہے شام بہاری ہے اردو بولنے والا ہے۔ پیدائشی طور پر مشرقی پاکستان تھا اس لیے وہ متوازن رویہ رکھتا ہے اور گلابی اردو بولنے والوں سے چڑتا نہیں۔ اس کے لیے مشرقی پاکستانی خوشبو اور بنگلہ

دیشی رنگ لہر دکھاتا ہے شام بارکپوری کے افسانوں کی یہ اولیت ہی سب سے بڑی خصوصیت بن کرا بھری ہے۔

ڈپٹی نذیر احمد اور پریم چند کو اردو فکشن میں جو پائندگی حاصل ہے وہ بھی اولیت پر بنیاد رکھتی ہے۔ کئی سنیئر ادیبوں نے شام کے افسانوں کو ایک اولین اشاعت ہونے کے حوالے سے کارنامہ قرار دیا ہے۔ ان میں رئیس امروہی ڈاکٹر نورالدین ڈاکٹر کلیم سہرابی' ڈاکٹر احمد سجاد' ڈاکٹر چوپڑا' ڈاکٹر سید یوسف حسین' پروفیسر جگن ناتھ آزاد' پروفیسر ظہیر احمد صدیقی ڈاکٹر سلیم اختر' ڈاکٹر گوپی چند نارنگ' پروفیسر وقار عظیم' قیوم نظر اور نصیر انور شامل ہیں۔

پروفیسر وقار عظیم کہتے ہیں کہ

''شام نئی نسل کے ادیبوں میں ایک ممتاز مقام کرے گا۔''

رئیس امروہی کی رائے اس طرح ہے۔

''بنگلہ دیش میں بظاہر اردو کا چراغ گل ہو گیا ہے۔ البتہ کچھ باہمت لوگوں نے ادھر ادھر اپنے دیئے جلا رکھے ہیں شام بارکپوری ان ہی الوالعزم لوگوں میں سے ایک ہے۔ ان کے افسانوں میں پدما اور میگھنا کی لہروں کی روانی اور سابق مشرقی پاکستان کی پر از جذبات اور بھرپور زندگی پوری طرح منعکس ہے۔''

بنگلہ دیش بہر حال ایک اسلامی ملک ہے اور یہی وہ اکائی ہے جو مشرقی پاکستان کی صورت میں قائم ہوئی تھی۔ ایک انچ زمین بھی ادھر ادھر نہیں ہوئی۔ پاکستان ایک نظریاتی حقیقت کی طرح وجود میں آیا جبکہ بنگلہ دیش ایک انتظامی غلطی کی پاداش میں بنا۔ حقیقت کم کم بدلتی ہے اور غلطیوں کا ازالہ ہوتا رہتا ہے۔ ایک غلطی کا ازالہ ہو گیا ہے۔ اسلامی ریاست بنگلہ دیش شاعر مشرق علامہ اقبال کے اس نظریے کا عملی اظہار ہے جس میں انہوں نے برصغیر میں مسلمانوں کے لیے سٹیٹس قائم کرنے کی تجویز رکھی تھی انہوں نے ایک سٹیٹ پر زور نہیں دیا تھا۔ چنانچہ جغرافیائی مجبوریوں کے نتیجے میں بنگلہ دیش وجود میں آیا۔ اس طرح اب مسلمانوں کی دو ریاستیں ہو گئی ہیں حیدر آباد دکن کے علاوہ کئی اور ریاستیں بھی بنیں گی۔ کشمیر تو پاکستان کا حصہ ہے مگر ہم اسے ایک مسلم ریاست کے طور پر قبول کرنے کو تیار ہیں ہم متحدہ ہندوستان کے خلاف نہیں تو ہندو کیوں مسلم ہندوستان کے خلاف ہیں۔ بنگلہ دیش کی صورت میں پاکستان نہیں ٹوٹا ہندوستان ایک بار پھر ٹوٹا ہے۔

شام بارکپوری نے اپنے افسانوں میں ایسا انداز اختیار کیا ہے جیسے ابھی تک ان کے وجود میں بنگلہ دیش اور مشرقی پاکستان دونوں ملکوں کی مٹی ایک ساتھ اڑی پھرتی ہے اور اسے منزل نہیں مل رہی۔ تاریخی اور تہذیبی طور پر بکھرنے والوں کی کہانی کا فرض اس نے

اپنے ذمے لے لیا ہے۔ وہ دکھوں کے قسم قسم کے نام رکھ رکھ کے دھوکہ دینے والوں کو پہچان گیا ہے بنگلہ دیش کی چار دیواری میں بند کر دیئے جانے والوں پر ایک کھڑکی اس نے کھولی ہے میں نے اس کھڑکی سے اندر دیکھا تو دریا میں جا پڑا۔ دریا ہی دریا ان دریاؤں میں تب بھی طوفان لائے جاتے تھے۔ اب بھی طوفان ہی بھیجے جا رہے ہیں غریبوں مظلوموں کے لیے خس و خاشاک بننا ہی رہ گیا ہے۔ انہیں نہ پاکستان حکمران بچا سکے اور نہ بنگلہ دیشی حکمران انہیں کہا گیا تھا کہ بنگلہ دیش بن گیا تو یہ دریا ان کے اشارے پر چلیں گے۔ انہیں اب پتہ چلا کہ اشارہ تو کسی اور طرف سے ہوتا ہے۔ دریاؤں کے غصے کو روکنے کے لیے سازشوں کا بند نہیں ٹھہرا کرتا۔ فرخا بند بھی کام نہ آیا۔ جب چاہا پانی کا منہ موڑ دیا۔ بنگلہ دیشی پانیوں کی خوراک بننے لگے جب چاہا اس کا لالچی منہ بند کر دیا اور آب حیات دلدل کے روپ میں کہیں چھپ کر بیٹھ گیا دلدل بھی مسافروں کو ہڑپ کر لیتی ہے اور یہ دریاؤں کا وجود ہوتی ہے۔

ایک اور دریا کا سامنا تھا منیر مجھ کو
میں ایک دریا کے پار اترا تو میں نے دیکھا

شام نے افسانے لکھ کر کئی دریاؤں میں اپنے ساتھ دوسروں کو بھی ڈبکیاں لگوائی ہیں اس نے اپنی تینوں کتابوں کے نام اپنے دریاؤں کے حوالے سے رکھے ہیں۔ دریائی نام کی یہ کتابیں جزیروں جیسے اوصاف رکھتی ہیں۔ مگر یہ دریاؤں کو پار کرنے والوں کے واقعات نہیں ڈوبنے والے کے قصے بھی ہیں۔ ان کی کہانیاں ہیں جو نہ ڈوبنے دیئے جاتے ہیں۔ نہ کسی کو کنارے لگتے ہیں۔ ایک بحران میں مبتلا آدمیوں کا نقشہ ہے۔ شام اپنے افسانے ''اجنبی جزیرے کا مسافر'' کے آخری میں لکھتا ہے۔

''وہ بے چارگی کی تصویر بنا کر کبھی ان کی طرف اور کبھی دریا کی طرف دیکھنے لگا۔ ان لوگوں کے جذبات کا الاؤ بھڑک اٹھا۔ ایک نے جھپٹ کر اس کا تھیلا چھین لیا۔ تھیلے میں سے اس کا سامان نکال کر اپنے قبضے میں کرنے لگے تھیلے میں سے کبوتر نکل کر اڑ گیا وہ بے بسی سے کھڑا تماشا دیکھنے لگا چند لوگوں کو ان کا حصہ نہ ملا تو اس کی طرف غضب ناک نظروں سے دیکھنے لگے۔ وہ سر سے پاؤں تک کانپ گیا۔ اپنی جان بچانے کے لیے سرپٹ بھاگا۔ اسے محسوس ہوا کہ آج کا ہر انسان بھاگ رہا ہے۔ دنیا کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک جیسے کسی کو جائے پناہ نہ مل رہی ہو۔ اور زندگی کی طرح زمین بھی تنگ ہو رہی ہو۔ جب وہ دریا کے مغربی کنارے پر پہنچا تو آمد و رفت کا کوئی وسیلہ نہ تھا تمام کشتیاں ہٹالی گئی تھیں۔ ندی پار کرنا ایک دشوار مسئلہ بن گیا۔ اگر پل صراط ہو تو وہ شاید اسے بھی پار کرنے کی کوشش کرتا۔ اس کا ذہن ماضی کی طرف گیا جب اس نے اس سرزمین پر قدم رکھا تھا۔ سورج بادل کی اوٹ میں چھپ گیا تھا۔ لہریں ساحل سے ٹکرا رہی تھیں اس کے پاؤں گیلی مٹی میں دھنس گئے تھے۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے دلدل میں پھنس گیا ہو۔''

دکھوں کا ایک پلندہ شام نے خالی جھولیوں میں پھینک دیا ہے۔ کہیں کہیں محسوس ہوتا ہے کہ دکھ جھولی سے ادھر ادھر بھی گر پڑے ہیں۔ اس نے دکھ بیان کیے ہیں۔ دکھوں کے بارے میں بیان نہیں جاری کیا۔ ایک سیاست دان اور ایک ادیب میں فرق واضح ہے مگر سقوط مشرقی پاکستان کے تناظر میں سیاسی تصنیفات پر نظر ڈالی جائے تو ان میں بھی ایک تخلیقی ٹیس دل میں چبھتی ہے۔ پاکستانی دانشوروں میں سے ڈاکٹر صفدر محمود کی تصنیف ''پاکستان کیوں ٹوٹا'' ایک بھرپور تجزیے کا آئینہ ہے۔ اس میں ہماری مشترکہ سیاسی غلطیوں کے کئی عکس ہمیں شرمندہ کرتے ہیں۔ ان کے برعکس کئی تاریخی سازشوں کا احوال ایک جال کی طرح ہمارے اردگرد تنگ ہوتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی اس کتاب میں ''کیوں'' کا جواب تلاش کرنے کی کوشش کی گئی ہے اس کے ساتھ ایک اور سوال ''کیوں نہیں'' کا تیر بھی ہمارے دل میں پیوست ہوتا ہے۔ اس سوال کا جواب ہم اپنے دل پر لکھا ہوا پاتے ہیں۔ مگر اسے پڑھنا نہیں چاہتے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب بنیادی طور پر ادیب ہیں۔ شام صاحب یہ کتاب پڑھ کر دیکھیں شاید کچھ اور افسانے لکھ سکیں۔

شام کے تقریباً ہم عمر پاکستانی ادیبوں میں سے طارق محمود کا ناول ''اللہ میگھ دے'' مشرقی پاکستان اور بنگلہ دیش کی سرحد پر کھڑے ہو کر لکھ گیا ہے۔ یہ تخلیقی ادب پارہ ایک فکر انگیز تحریر ہے۔ طارق کا انداز نظر اشاروں اور استعاروں سے ترتیب پاتا ہے ایک دلکش اسلوب میں سارے واقعات ایک واقعے میں جمع ہوتے رہتے ہیں شام بارکپوری ایک براہ راست اسلوب سے کہانی کو روانی دیتا ہے۔ دریاؤں کی دھرتی کا باسی یہ شخص اپنے ساتھ دوستوں کو بھی بہا کے لے جانا چاہتا ہے۔ ڈوبنے کے خوف کو بھی ہمسفر بناتا ہے مگر ڈوبنے دیتا نہیں۔

اس کے افسانوں میں مجھے دعائیں اونچے سروں میں پکارتی ہوئی لگتی ہیں جبکہ طارق کے ہاں ناول کا عنوان ہی ایک دعا ہے مگر ناول میں موجود کرداروں کو دعائیں بھول گئی ہیں۔ طارق بھی اولڈ ڈھاکہ ین ہے اور مشرقی پاکستان میں کچھ عرصہ رہ کے آیا ہے۔ تب وہاں اس کے ساتھ تین اور طالب علموں کی ایک ٹولی تھی۔ ان دنوں ادھر ادھر بنگلہ دیش کی بوبارود کے دھوئیں کی طرح پھیل کر اڑ جاتی تھی آفتاب احمد شاہ محمد اظہار الحق اور خالد اقبال یاسر یہ تینوں شاعر ہیں شاعر بھی غزل کے ان کی غزلوں میں اپنے وطن کے ایک گمشدہ علاقے کی نشانیاں چھپی ہوئی پڑی ہیں۔ آفتاب کے شعری مجموعے کا نام ''فرد جرم'' اور اظہار الحق کے شعری مجموعے کے نام ''غدر'' ہے ان دونوں ناموں میں کوئی بجھارت ہے۔

بنگلہ دیش کو بنے ہوئے سترہ برس ہو گئے ہیں۔ مغربی پاکستان ''میں اب مشرقی پاکستان کے لیے کوئی خاص فکر مندی نہیں کچھ لوگ اسے سیدھی سیدھی بے حسی کا نام دیتے ہیں۔ مگر لگتا ہے کہ اپنے بھائیوں کے بارے میں پاکستانیوں کی کیفیت یہ ہے کہ جہاں رہو

خوش رہو۔ سقوط ڈھاکہ کے دن پاکستان سے محبت رکھنے والے قیامت سے دوچار ہوئے۔

یہ قیامتیں جو گزر گئیں تھیں امانتیں کئی سال کی سچے پاکستانیوں یعنی پاکستان عوام نے کسی امانت میں خیانت نہیں کی۔ بے بس آدمی کو صبر آ ہی جاتا ہے۔ لوگوں کو صبر آ گیا ہے۔ وہ کسی احساس جرم میں مبتلا ہیں۔ بنگلہ دیش کے عوام بھی علیحدگی کی مصنوعی فضا میں مقید نہیں رہنا چاہتے۔ وہاں وابستگی کی لہر پھر زوروں پر ہے۔ ایک امید کا اجالا دلوں کے آس پاس پھڑ پھڑاتا ہے آ ملیں گے سینہ چاکاں چمن سے سینہ چاک۔

بھارت کی سیاست خواہشوں اور سازشوں کے غبار میں الجھتی جا رہی ہے بھارتیوں نے سری لنکا اور مالدیپ میں بھی ایسا ہی سفر آغاز کیا ہے پاکستان ان کے راستے میں بھاری پتھر ہے۔ ایک سابق پاکستانی حسین محمد ارشاد صدر بنگلہ دیش میں بھی ان کے سامنے ایک پہاڑ کی طرح کھڑے ہیں۔ یہ پہاڑ خلیج بنگال میں ایک جزیرہ بنتا جا رہا ہے۔ مشرقی پاکستان کی طرح بھارت نے پہلے سری لنکا میں تامل ٹائیگرز تیار کیے انہیں مسلح کیا اور اپنی حکومت کے خلاف ہنگامہ اڑا کر دیا پھر سری لنکا کی حکومت کی مدد کو فوج بھیج دی۔ چونکہ تامل ٹائیگرز کو مکتی باہنی نہ بنایا جا سکا تھا اس لیے ان بہادروں نے بھارتی فوجیوں کو لوہے کے چنے چبوائے خون کا دریا ٹھاٹھیں مارتا ہے تو فوجیوں کے ٹھٹھ اور تنکوں کے ڈھیر میں کوئی فرق نہیں رہتا۔ تامل کے شیر جوان جنہیں ہندوالوں کا بحر ہند تک تعاقب کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ مالدیپ کے جزائر میں بھی وہ یہی چکر چلا کر لٹیروں کی طرح داخل ہوئے۔ ایک دن یہاں بھی ان کے لیے لنگوٹی بچانا بھی مشکل ہوگا۔ ہر جگہ لوگوں کو پتہ چل ہی جاتا ہے کہ ان کے ساتھ ہاتھ ہو گیا ہے اور ان کے ہاتھ خالی ہیں خالی ہاتھ کف افسوس ملنے کے لیے ہوتے ہیں۔ تالی بھی دوسروں کے لیے بجائی جاتی ہے۔ خالی ہاتھ دعا کے لیے ابھی اٹھتے ہیں۔ اور کبھی دشمنوں کی گردن تک بھی پہنچتے ہیں۔ بھارتی سیاستدان وقتی کامیابیوں کے باوجود خوف کے صحرا میں چل رہے ہیں۔ وہ پورے جنوبی ایشیا کو اپنے صحرا میں تبدیل کرنا چاہتے ہیں۔ انہیں شاید معلوم نہیں کہ صحرا میں بگولے بھی ہوتے ہیں۔ اور یہ بھی سوچنے والی بات ہے کہ ”بگولے رقص میں ہوتے ہیں صحرا میں نہیں ہوتے۔“ جذبوں کا رقص نیم بسمل طوفان بردوش ارادوں کا دیباچہ ہوتا ہے کیا یہ بات بھی بھارتی قیادت کے لیے لمحہ فکریہ نہیں کہ تامل ٹائیگرز اور تامل ناڈو میں کوئی خاص فرق نہیں مکتی باہنی اور خالصتان فورس ایک ہی سلسلہ تو ہے۔ فکری اور تخلیقی سطح پر بنگلہ دیش کے ادیبوں اور دانشوروں کا ردعمل نظر آنے والے رنگ میں ظاہر ہونا شروع ہو گیا ہے۔ شام بارکپوری اپنی کہانی میں کس کس کی کہانی کہہ رہا ہے۔

”باغبان تو ہمیں دوسروں کے رحم و کرم پر چھوڑ گئے مگر اتنا نہیں سوچا کہ ان کے جانے کے بعد کیا ہوگا۔ ابھی پھولوں کے درمیان

گفتگو جاری تھی کہ اچانک کچھ لوگ ہاتھوں میں ڈالیاں لیے باغ میں داخل ہوئے اور پھولوں کی گل چینی شروع کر دی۔ ڈالیاں پھولوں سے بھر بھر کر اپنے ساتھ لے گئے اور بقیہ مرجھائے ہوئے پھول اور نوخیز غنچے مستقبل کی فکر سے پریشان ہو گئے کہ آئندہ ان کے ساتھ کیا حادثہ پیش آئے گا۔ ان پودوں سے پھول اس طرح چن لیے گئے جیسے کسی ماں کی ہری بھری گود خالی ہو گئی ہو۔''

اپنے چوتھے مجموعے ''سورج مکھی میں شام نے روایتی اسلوب سے گریز کرتے ہوئے علامتی اور استعاراتی اسلوب اپنایا ہے۔ مگر کہیں بھی کہانی کو نقصان نہیں پہنچنے دیا۔ ڈاکٹر آغا سہیل کے مطابق ''شام ایک دردمند دل کا حامل' حساس' اور روشنی طبع امیر انسان ہے۔ روایتی کہانی کہتے کہتے ادب جاتا ہے تو علامت کے انداز میں بات کو اہل درد تک پہنچاتا ہے۔'' قاری تک براہ راست پہنچنے میں بھی ایک لطف ہے مگر اسے مائل کرنا کہ کہانی میں اپنی کر میں بھی شامل کرے کہانی کے کرداروں سے باتیں کرے اور اصل بات کو سمجھنے کی کوشش کرے۔ شام نے شعوری کوشش کر کے پہیلیاں نہیں لکھیں۔ اپنی اس کتاب میں ایک یہ انفرادیات بھی پیدا کر دی ہے کہ ہر کہانی سے پہلے ایک دو نقادوں کی مختصر تجزیاتی رائے بھی شامل کر دی ہے اس طرح افسانہ گرہیں کھولنے میں مزاحمت نہیں کرتا۔ یہ آرا پڑھنے والوں کے لیے گہری دلچسپی کا باعث ہوں گی۔ اس طرح افسانے کی ایک تصویر بھی سامنے آجاتی ہے''سورج مکھی'' میں شامل زیادہ تر افسانے اسی لمبے کی رسی سے بندھے ہوئے جس کا ذکر پچھلے صفحات میں کیا جا چکا ہے۔ ایسی کچھ آرائیاں یہاں درج کی جا رہی ہیں۔

ڈاکٹر سلیم اختر شام کے افسانے ''روبوٹ'' کے حوالے سے لکھتے ہیں۔

''اردو افسانے کی خدمت تو شام بار کپوری اب بنگلہ دیش کی پہچان بن چکا ہے۔ اس نے اپنے افسانوں کے ذریعے پاکستان میں اپنے قارئین کا ایک حلقہ پیدا کر لیا ہے۔ اس کی مختصر کہانی ''روبوٹ'' اپنے اندر گہرے طنز کی کاٹ رکھتی ہے۔ ترقی پذیر ممالک میں نا اہل افسران ہر اچھی چیز کو برائی میں تبدیل کر دیتے ہیں۔ یہ کہانی شام کے فنی شعور کی شاہد ہے۔''

ڈاکٹر ابو سعید نورالدین ''ممگن کی چیخ'' کے بارے میں لکھتے ہیں۔''

''یہ افسانہ علامتی ہے۔ شام نے اس میں استعارہ کے پردے میں غیر ملکی جارحیت اور توسیع پسندی کے خلاف فنکارانہ انداز میں بھرپور احتجاج کیا ہے۔''

''تازہ سانسوں کا موسم'' کے حوالے سے شمس الرحمان فاروقی لکھتے ہیں۔

''انسان اپنی بھوک مٹانے' زمین سے جلد از جلد اور زیادہ سے زیادہ حاصل کرنے کے خود میں اس قدر منہمک ہے کہ وہ زمین

کے وسائل کا ہی خاتمہ کرنے میں لگ گیا ہے اور اس کو خبر نہیں کہ جس شاخ پر وہ بیٹھا ہے اسی کو کاٹ رہا ہے شام کے افسانے میں فطرت کے اس المیے کا دردمند اظہار ہوا ہے۔ افسانہ نگار ہمیں تنہا نہیں چھوڑتا اور ہمارے جذبہ تعمیر کو برانگیخت کرتا ہے۔ اس موضوع پر افسانہ لکھنا بہت مشکل کام ہے شام نے اس بھاری پتھر کو اٹھانے کی کوشش تو کی۔

''مصلوب روشنی کا نوحہ'' قدروں کی آویزش کی داستان ہے جو ہر عہد کا مقدر ہے۔''

یہ ڈاکٹر خلیق انجم کی رائے ہے۔ اس افسانے کا آخری اقتباس کا مطالعہ بھی دلچسپی خالی نہ ہوگا۔

''اس دن مختلف اخباروں کے نمائندوں نے ان کے گھر دھاوا بول دیا۔ گھر میں امینہ بیگم کے علاوہ کوئی نہ تھا۔ انہوں نے ان پر سوالات کی بوچھاڑ کردی۔

بیگم صاحبہ نے صرف اتنا کہنے پر اکتفا کیا کہ میں باپ بیٹے کے جھگڑے میں پڑنا نہیں چاہتی۔ میرے لیے دونوں اہم ہیں۔ میں کسی کو بھی چھوڑ کر نہیں رہ سکتی میں نہ صرف شوہر کی بیوی ہوں بیٹے کی ماں بھی ہوں۔''

شام کے افسانوں میں رشتوں میں الجھے ہوئے مسائل کے حوالے سے سوالات ہیں اور جواب گم ہیں۔ اصل میں سوال ایک ہوتا ہے اس کے غلط جواب سے دوسرے سوالاب پیدا ہوتے ہیں۔ شام سوالات میں گھری ہوئی حیات کا نمائندہ نہیں رہنا چاہتا۔ اسے اپنے سوال کا صحیح جواب معلوم ہے۔ مگر اس کے سوال کے تیور دیکھنے والے ہیں۔ جب سوال میں احتجاج یا التجا شامل ہوتی ہے تو اس کا جواب سب کو معلوم ہو جاتا ہے۔ تب وہ سوال ایک دلدوز پکار بن جاتا ہے دیکھنا یہ ہے کہ پکار للکار کب بنتی ہے۔''

◆◆◆

اردو ڈرامے کا مانوس اجنبی

امتیاز علی تاج کا ڈرامہ ''انارکلی'' ہو بہو سٹیج نہ ہو سکا ہمارے ہاں لکھا جانے والا اور کیا جانے والا ڈرامہ دو مختلف چیزیں ہیں۔ ویسے بھی جو باتیں لکھی جاتی ہیں کی نہیں جاتیں اور جو کی جاتی ہیں وہ لکھنے نہیں دی جاتیں۔ ہمارے پاس ڈرامے کے کئی معنی ہیں کسی چالاک اور عیار آدمی کے لیے کہا جاتا ہے کہ ''اے بہت وڈا ڈرامہ ہے۔'' باصر سلطان کاظمی نے اپنے ڈرامے سے پہلے ''سٹیج یا کتاب'' کے عنوان سے دیباچہ لکھ کر اس بات کو تازہ کر دیا ہے کہ ابھی تک ہمارے لکھے ہوئے لفظ اور بولے جانے والے لفظ کو درمیان بڑے فاصلے ہیں۔

سب سے پہلے ہمارے سٹیج ڈرامے کا آغا حشر کر دیا تھا پھر الحمرا اور اوپن ایئر تھیٹر نے اس کا حشر نشر کر دیا۔ پہلے مکالموں کے نام پر بیت بازی کی جاتی اب جملہ بازی بلکہ ہے۔ ہمارے سٹیج ڈرامے میں نہ کہانی ہوئی ہے نہ خیال نہ اداکاری نہ کوئی منظر اور نہ کوئی خوش منظر اداکارہ پردہ اٹھتا ہے اور لوگ ایک دوسرے کے مقابلے میں مکالمے بولتے دکھائی دیتی ہے جملوں اور حملوں میں کوئی فرق نہیں رہ جاتا۔ اس سلسلے میں ڈرامہ نگار کو کوئی خاص زحمت نہیں اٹھانا پڑتی یہ آسان کام بھی ہمارے اداکار اداکارائیں بذات خود اسی قت یعنی فی البدیہہ کر لیتے ہیں۔ بعض اوقات تو جگتوں کا باقاعدہ سلسلہ چل پڑتا ہے۔ اور سٹیج پر دوسرے کردار چپ سادھے یہ تماشا دیکھتے رہتے ہیں ان کی یہ ہمت قابل داد ہے کہ جب پورا ہال قہقہوں بڑھکوں اور تالیوں سے گونج رہا ہوتا ہے تو مجال ہے وہ ہنس پڑیں سامعین کی داد پر بعض اوقات کار وقفہ دے دیتے ہیں۔ اس معاملے میں یہ اداکار شاعروں سے بھی زیادہ حریص معلوم ہوتے ہیں بعض اوقات سامعین بھی جگت بازی میں باقاعدہ شریک ہو جاتے ہیں۔ اکثر سامعین جیت جاتے ہیں۔ اصل میں ہم بہت بڑی جگت باز قوم ہیں۔

لوگ بھی کیا کریں؟ انہیں اور تو کہیں ہنسنے اور مسکرانے کا موقع ہی نہیں دیا جاتا۔ ہنسنے کے لیے دفتر میں صاحب سے اور گھر میں بیوی سے اجازت لینا پڑتی ہے گھر اور دفتر میں ہر وقت ٹریجڈی ڈرامے کا کوئی نہ کوئی سین ہوتا رہتا ہے۔ لوگ الحمرا میں یا ٹی وی کے سامنے بیٹھ جاتے ہیں کہ دو گھڑی پھکڑ تول لیں۔ ہنس بول لیں وہ ہنسنے کے لیے اتنا تیار ہوتے ہیں کہ پردہ اٹھتے ہی ہنس پڑتے ہیں۔

ہماری فلمی صنعت نے بھی لوگوں کا مذاق خراب کرنے میں بڑے بڑے معرکے مارے ہیں۔ اس ضمن میں بڑی بحثیں ہو چکی ہیں۔ میں صرف اتنا عرض کروں گا کہ جہاں فلم ساز ہدایت کار اداکار گلوکار نغمہ نگار مکالمہ نگار اور کہانی نگار ایک ہی آدمی ہو تو پھر فلمی

صنعت کا کیا بنے گا قیام پاکستان اب تک ہم جیسے ایک ہی فلم دیکھ رہے ہیں۔

ٹی وی ڈرامے کو ادب ہی نہیں سمجھا جاتا بلکہ جس کہانی کی ڈرامائی تشکیل کر دی جائے اس کہانی کے سلسلے میں یار لوگ مشکوک ہو جاتے ہیں۔ ہمارے بہت کم بلکہ نہ ہونے کے برابر ٹی وی ڈرامے ہوں گے جنہیں ادب کے خانے میں رکھا جا سکتا ہے حالانکہ ٹی وی ڈرامہ لکھنے والے زیادہ تر ادیب وشاعر ہیں اور خاصے معروف ممتاز اور سینیئر پھر ان کے اکثر ڈراموں کی عمران کے ٹیلی کاسٹ ہونے کے بعد ختم کیوں ہو جاتی ہے؟ کچھ ڈرامے ذہنوں میں تھوڑے دنوں تک ندہ رہ کر ادھ موے کیوں ہو جاتے ہیں؟ ایک سوال ہے اور جواب گم ہے۔

سٹیج اور ٹی وی ڈرامے بہت کم کتابی شکل میں آئے ہیں۔ ٹی وی ڈرامے کے حوالے سے بات ڈرامہ نگار کی اتنی ہوتی بھی نہیں۔ وہ جو بات لکھ دے جب کوئی اداکار بولے گا تو لوگ سے اداکار ہی کا کریڈٹ سمجھیں گے اور محمد علی تو کہتا ہے کہ ڈرامہ نگار کیا لکھتے ہیں ہم جو بول دیں وہی ڈرامہ ہوتا ہے۔ اس کے برعکس ہم عالمی ادب پر نظر ڈالتے ہیں تو ڈرامہ بہترین ادب میں شمار کی جانے والی صنف سخن سمجھی جاتی ہے۔ شیکسپیئر کے ڈرامے ادب پارے بھی ہیں اور سٹیج پر بھی بے حد مقبول ہیں۔ وارث شاہ نے شاعری میں ڈرامہ لکھا ہے گاؤں کے پنڈال میں ہیر سٹیج کی جاتی ہے لیکن اردو میں ایسا کوئی قابل ذکر ڈرامہ اب تک نہیں ہے۔

ایک بڑے شاعر کے بیٹے ایک شاعر ناصر سلطان کاظمی نے کتابی شکل میں اپنا ڈرامہ دے کر ہمیں سوچنے پر مجبور کر دیا ہے۔ اس نے کتاب اور سٹیج کی دوئی کے مغالطے کو ختم کر دیا ہے۔ اس نے بساط ڈرائنگ روم کی میز سے اٹھا کر سٹیج پر بچھا دی ہے اور کچھ لوگوں کو شطرنج کھیلنے پر لگا دیا ہے۔ شیکسپیئر نے کہا تھا کہ دنیا ایک سٹیج ہے اور ہر آدمی اپنا اپنا رول ادا کرنے کے بعد رخصت ہو جاتا ہے۔ باصر کی یہ کتاب پڑھنے کے بعد یہ کہا جا سکتا ہے کہ زندگی ایک بساط کی طرح بچھی ہوئی ہے ہم سب شطرنج کے مہرے ہیں۔ کوئی حکمران سے کوئی اس کا چمچہ ہے اور کوئی آدمی یعنی پیادہ ہے اور اس کی یہ ڈیوٹی ہے کہ حکمران کی حفاظت کرتے کرتے قربان ہو جائے۔ شطرنج بذات خود ایک ڈامہ ہے جو صدیوں سے ہو رہا ہے باصر نے اسے ایک اور ڈرامہ بنا کر پیش کر دیا ہے۔

ایک بات بہت اہم ہے اور ایک خاص پہلو سے مختلف ہے وہ یہ ہے کہ شطرنج کے کھلاڑی کو اپنی تمام تر توجہ مرکوز کرنا پڑتی ہے۔ ہماری توجہ آج کل کئی ہزار کاموں میں بٹ گئی ہے۔ باصر کاظمی اپنے عظیم والد ناصر کاظمی کی طرح شطرنج کا ایک اچھا کھلاڑی ہے عشق بھی شطرنج کی طرح ایسا کھیل ہے جس میں مکمل سپردگی کی ضرورت ہوتی ہے اور باصر بازی عشق میں بھی کمال رکھتا ہے۔ دھیرے دھیرے سلگنے اور تنہائیوں کو آباد کرنے کا ہنر اس نے اپنے والد سے سیکھا ہے۔

ڈرامے کے میدان میں باصر کاظمی ایک مانوس اجنبی کی طرح داخل ہوا ہے راتوں کو جاگنے والے آدمی کی صفات رکھنے والا یہ نوجوان درویشی اور فقیری کے سفر پر تنہا نکلا ہوا ہے۔ اس نے ٹی وی کے لیے لکھنے کی بجائے قارئین کے لیے لکھا ہے تاکہ ڈرامے پڑھنے والوں کے ذہنوں میں سٹیج ہوتے رہیں۔ خاموش اکیلے اور بظاہر پرسکون باصر کاظمی کے اندر اضطراب کا ایک جہاں پوشیدہ ہے۔ نجانے وہ اپنے تنہا باطن میں کیسی کیسی لڑائیاں لڑتا رہتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ڈرامہ وہی شخص لکھ سکتا ہے جو اپنے اندر جذبوں اور ارادوں کی کشمکش اور آویزش کبھی کبھی اس طرح دیکھے جیسے لڑکے سڑک پر کتوں کی لڑائی دیکھتے ہیں اب تو کتوں کی بجائے ''بندوں'' کہنا چاہیے کہ یہ منظر ہمارے سامنے زیادہ پیش ہوتے ہیں۔ ہم یہ سب کچھ باہر دیکھنا چاہتے ہیں تو یہ تماشا ہوا ڈرامہ تو نہ ہوا اور تحقیق کہ ہم ایک تماش بین قوم ہیں۔ ہم اپنے باطن میں فطرت کی گہرائیوں میں دیکھنے کی جرات نہیں رکھتے۔ اس لیے معاشرے میں توڑ پھوڑ دنگا فساد اور دھماکے شماکے کراتے رہتے ہیں البتہ جس کے دل میں شور ہو وہ باہر شور شرابا کیسے پسند کرے گا۔

باصر کاظمی نے اپنے اندر کی ایک جدوجہد سے ہمیں آگاہ کیا ہے اس ڈرامے کا مرکزی کردار خوش گفتاری و خوش خصال سارب مجھے باصر کا ہمزاد لگتا ہے۔ اصل میں ڈرامہ تو تبدیلی کی ایک خواہش کا اظہار ہے۔ باصر نے اس لیے یہ بساط نہیں بچھائی ہے کہ وہ ہارے یا جیتے وہ کچھ اور چاہتا ہے۔ رامبو نے کہا تھا زندگی کو بدلو اور زندگی ذات کی تبدیلی کے بغیر نہیں بدل سکتی۔ ہمارے سٹیج اور ٹی وی ڈرامے سے کسی قسم کی تبدیلی کی توقع کرنا بیکار ہے جس طرح ہم برسوں سے خطبہ جمع سنتے آتے ہیں اور برسوں سے ٹی وی پر جمعے کے دن ڈرامہ دیکھتے آرہے ہیں۔ ان دونوں کا کوئی اثر ہم پر نہیں ہوا۔

ایک آخری بات شرنج کے فن کے حوالے سے کہ بادشاہی نظام افسر شاہی اور آمریت کی حفاظت کا تصور ہماری تفریح گاہوں میں بھی سرایت کر گیا ہے۔ بنی نوع انسان آج تک آمریت کے مزے چکھ رہی ہے۔ سب سے قدیم جمہوریت برطانیہ میں بھی بادشاہت موجود ہے۔ اور شاہی خاندان انگریزوں کا آئیڈیل ہے۔ سیاست سے زیادہ دلچسپ شطرنج کوئی نہیں چالیں چلی جاتی ہیں مہرے پٹتے ہیں پیادے مرتے ہیں اور بادشاہ محفوظ رہتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ باصر جو تبدیلی چاہتا ہے وہ ہمارے اندر تو واقع ہو سکتی ہے باہر نہیں۔ باہر وہ تبدیلی کب آئے گی فی الحال یہ مطالبہ کافی ہے کہ شطرنج کو کم از کم ممنوع قرار دیا جائے یا پھر اس کھیل کے اصول بدل جائیں۔ زندگی میں حکمرانی اور محکومی کی فضا میں موجود صورت حال کب گدلے گی ظالموں کی بساط کب الٹی جائے گی۔

یہ ڈرامہ پڑھ کر میں سوچتا ہوں کہ جو کچھ اس تحریر میں ہوا کبھی ہوگا بھی۔ کیا وہ وقت بھی آئے گا کہ کوئی نوجوان اپنے اصولوں خوابوں اور اپنی تنہائیوں کے لیے جاہ و منصب اور عیش و عشرت کی زندگی کو ٹھکرا دے'' اور یہ بھی ہوگا کہ کبھی کہ اعلیٰ صفات رکھنے والا کوئی

عام آدمی معاشرے میں ص آحب عزت بن جائے؟ ایسا کیوں ہے کہ صاحب فکر لوگ ہی فکر مندیوں میں گھرے ہوئے ہیں؟ باصر کاظمی کے ڈرامے میں جو کردار متاثر کرتا ہے۔ وہ ص آحب کردار نوجوان ہے۔ اچھی سوچوں اور اچھے جذبوں کا مالک ہے اس کی گفتگو میں کسی گمشدہ آواز کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ یوں تو ڈرامے میں سبھی لوگ فراست بھرے فلسفیانہ مکالمے بولتے ہس ان کی باتیں غور و فکر کا مطالبہ کرتی ہیں اور خوشگوار بات یہ ہے کہ وہ تقریب سب نوجوان لوگ ہیں مگر سارب ان سب سے مختلف نوجوان ہے وہ باصر سلطان کاظمی کی نمائندگی کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ ایسے نوجوان بہت ہم کم ہیں جو گہری باتیں اپنے انداز میں کرتے ہیں اور ان کے قول و فعل میں جلا و جمال کی ایک جہتی ہو۔ ایک اور بھی حیران کرتی ہے کہ ڈرامے میں شہزادی شدرہ اپنی ذات میں سارب کی ہمراز نظر آتی ہے۔ ایوانوں میں بھی ایسے لوگ ہوتے ہیں جن کے دلوں میں درد دھڑکتا ہے پھر کیوں ہمیشہ حکمت اور حکومت میں فاصلے کبھی کم نہیں ہوئے یہ ایک المیہ ہے اور یہ بھی کم المیہ نہیں کہ جتنے خوبصورت مکالمے باصر کے ڈرامے میں پڑھنے کو ہمیں بار بار ملے ہیں وہ ہماری زندگی میں کہیں سنائی نہیں دیتے۔ ایسی باتیں کرنے والا کسی اور دنیا کا باسی سمجھا جاتا ہے۔ دنیا ایک سٹیج ہے اور اب یہاں وبساط جیسے ڈرامے سٹیج ہونا شاید بند ہو گئے ہیں۔

◆◆◆

انشائیے کا میٹھا کنواں

انشائیہ ایک متنازعہ صنف سخن ہے جسے نوجوان یونس بٹ نے ایک محبوب صنف سخن بنا دیا ہے۔ پاکستان کے ادبی منظر پر ایک ایسا گروہ بھی ہے جو انشائیہ کو اپنے دستر خوان کی سلاد سمجھتا ہے۔ یہ سلاد اس سبزی سے تیار ہوتی ہے جو ڈاکٹر وزیر آغا کے کھیتوں میں پیدا ہوتی ہے۔ اس سے صاف کر کے اور کاٹ کتر کے میز پر ڈاکٹر انور لگاتا ہے۔ کسی اور میز پر بیٹھا ہوا کوئی آدمی اپنی تحریر کو انشائیہ کہہ دے تو انور سدید جھگڑالو عورت کی طرح چلا چلا کر اور طعنے مہنے دے دے کر اسے ادب دشمن اور ملک دشمن ثابت کرنے میں جت جاتا ہے۔ اس طرح وہ وزیر آغا کے دشمنوں میں اضافہ کرنے کے علاوہ کوئی فائدہ نہیں اٹھاتا۔ وہ ادب میں فرقہ واریت کا سب سے با پر چارک ہے وہ انشائیے کو آغا صاحب کے کھاتے بلکہ کھانے میں ڈالنے کا کام اس طرح کہہ رہا ہے جیسے یہ کوئی وحی ہو۔ وزیر آغا نبوت کا دعوی کریں تو انور سدید انشائیے کو خدا کا کلام منوانے میں ذرا بھی تامل نہیں کرے گا۔ دبستان سرگودھا دراصل اردو ادب میں آغا خان گووہس کی تشکیل ہے ڈاکٹر سلیم اختر اپنی کتاب ''انشائیے کی بنیاد'' میں لکھتے ہیں۔

''انور سدید نے ادب میں خاندان غلاماں کی بنیاد رکھی

مشکور حسین یاد کوئی اعلان کریں نہ کریں نہیں جھوٹا نبی مشہور کر کے گردن زدنی قرار دے دیا جائے گا۔

مشکور صاحب انشائیے کے ایک سچے اسلوب کے نمائندے میں انہوں نے ایک واضح اجارہ دار کے خلاف قلم لہرایا۔ ان کے انشائیوں میں شائستگی اور شگفتگی باہم آمیخت ہو کر ایک خوبصورت دانش کی طرح چمکتی ہے۔

اس مضمون میں یہ باتیں مجھے اس لیے کرنا پڑ رہی ہیں کہ اب تک مسلسل اس صنف سخن پر مناظرہ جاری ہے۔ چنانچ ہوا یہ کہ کوئی آدمی کچھ لکھ نہیں سکتا تو اپنی تحریر کا نام انشائی رکھ لیتا ہے۔ اس کے خلاف سطحی قسم کے مضامین ت ادھر ادھر شائع کروا دیے جاتے ہیں مگر اس کا کچھ بگاڑ نہیں جا سکتا۔ الٹا انشائیے کا حلیہ مزید بگڑ جاتا ہے شاعری میں نثری نظم کچھ حقیقت رکھتی ہے۔ نثری اصناف میں انشایہ کو یہ حیثیت بھی نہیں مل سکی۔ شعر و ادب کی خاموش اکثریت اس سے پرہیز کرنے لگی ہے مگر یاد صاحب کے بعد یونس بٹ کو پڑھا تو اسے ایک صنف سخن ماننا ہی پڑا۔ یونس نے صرف انشائیے کو ہی نہیں منوایا اپنے آپ کو بھی منوالیا ہے۔ وہ ایک ذہین خاکہ نگار اور کامیاب ڈرامہ نگار بھی ہے۔ ابتدا اس نے انشائیہ سے کی ہے۔

وہ ایک مشکل اور ناہموار میدان میں اترا اور میدان مار لیا۔

انشائی اصل میں ایک ایسا میدان ہے جس میں کئی دروازے ہیں۔ کچھ آدمیوں نے صرف اپنے سامنے والا دروازہ کھول لیا ہے۔ان کے مطابق تازہ ہوا صرف اس دروازے سے آ رہی ہے۔ یونس نے سارے دروازے کھول لیے ہیں۔ وہ ہر طرف سے آ کر میدان میں جمع ہو رہا ہے اور انبار بنتا جا رہا ہے۔

میدان میں دروازوں کی بات عجیب لگتی ہے تو ان کے بارے میں کیا خیال ہے جو انشایئے کا رشتہ عشایئے سے جوڑتے ہیں۔ وہ یہ ڈنر کئی بار کھا بھی چکے ہیں۔انشایئے کے لیے آسانی سے کوئی مثال نہیں دی جا سکتی۔ یونس بٹ نے انشایئے کو بے مثال بنا دیا ہے۔

انشائیہ نگاری کے حوالے سے یونس بٹ کے بارے میں عطاء الحق قاسمی نے ایک خطاب میں کہا کہ

''اس انشائیہ نگار کے روپ میں ہیجڑوں کے گھر لڑکا پیدا ہو گیا ہے۔انشائیہ نگار فیملی کو خوشیاں منانی چاہیں۔''

خوشگوار حیرت کی بات یہ ہے کہ یونس بٹ کی تحریروں کو مشکور حسین یاد وزیر آ غا اور سلیم اختر حتیٰ کہ انور سدید نے بھی انشائیہ تسلیم کیا ہے۔اس کا انشائیہ کسی مخصوص پابندی اور تعریف کا محتاج نہیں۔اس نوجوان کا کمال یہ ہے کہ اس نے اپنے کنویں پر بڑے بڑے مخالفوں کو اکٹھا کر لیا ہے اور سب کو ایک برتن میں پانی پلا دیا ہے وزیر آغا نے انور سدید کے سامنے سلیم اختر کا جھوٹا پانی پی لیا ہے اسنے اپنے انشائیوں کی کتاب کا نام ''چاہ خنداں'' رکھا ہے۔یعنی جو اس کنویں سے پانی پیے ہنستا چلائے اس کے انشایئے کے مطالعے سے ہر شخص ایک جدا مسرت کی کیفیت محسوس کرتا ہے ہنستے ہوئے کچھ خوبصورت لوگوں کی ٹھوڑی میں گڑھا پڑ جاتا ہے اسے چاہ زنخداں کہتے ہیں۔ چاہ خندان اور چاہ زنخداں میں کوئی مشابہت یونس نے ضرور دیکھ لی ہوگی ویسے وہ خوبصورت لوگوں کو دیکھ کر خوش ہوتا ہے اور اسے دوستوں اور دوسروں کو خوشیوں میں شریک کرنے کا ہنر بھی آتا ہے۔اسی لیے تو اس نے یہ انشایئے لکھے ہیں۔ وہ دیہاتوں کی تہذیبی فضا سے بھی واقف ہے جہاں عورتیں کنویں پر پانی بھرنے آتی ہیں تو سارا ماحول سج جاتا ہے ورنہ اس کتاب کے لیے ''چاہ یوسف'' بھی ایک مناسب نام تھا کیونکہ انشایئے کی سلطنت پر غاصبانہ قبضے کے لالچ میں پھنسے ہوئے لوگ یونس کے ستھ وہی سلوک کرنے والے ہیں جو برادران یوسف نے اپنے اچھے اور سوہنے اور چھوٹے بھائی کے ساتھ کیا تھا۔ اب کھلم کھلا اس کی مخالفت انشایئے کے بہانے سے نہیں کی جا سکتی اس کے کنویں پر رونق بڑھتی جا رہی ہے مگر انور سدید اس کے لیے بھی کوئی گڑھا کھودنے میں مبتلا ہے۔شاید وہ اس ضرب المثل سے واقف نہیں چاہ کن را چاہ در پیش

انشائیہ کے ضمن میں مزاح کا معاملہ بھی مسئلہ بنا ہوا ہے۔ پہلے کوئی لکھنے والا بڑی آسانی سے مزاح طنز اور ظرافت کا ریاستوں

میں آ جا سکتا تھا اس کے لیے کسی ادبی لیڈر یا اس کے سیکرٹری صاحبان سے ویزا لینے کی ضرورت تھی اپنی پسند کی پابندیاں لگانے اور طرح طرح کے تقاضے کرنے سے بڑا ادب تو کیا ادب بھی تخلیق نہیں ہو سکتا۔ اس طرح کی پلاننگ سے جان بوجھ کر انشائیہ کو ایک مشکل صنف سخن بنایا جا رہا ہے۔

یونس بٹ کا اجتہاد یہ ہے کہ اس نے اسے آسانیوں کو مرقع بنا دیا ہے صورت حال یہ ہے کہ کچھ لوگ انشائیہ میں اتنے مزاح کے خلاف ہیں کہ آدمی ہنس پڑے۔ اگر محفل میں انشائیے کے دوان بھولے سے بھی کسی کی ہنسی نکل جائے تو انشائیہ نگار کو کچھ عرصے کے لیے اس گھرس نکال دیا جاتا ہے۔ اب تک انشائیہ کے نقادوں سے یہ طے نہیں ہو سکا کہ یہ تحریر سن کر ہنسا جائے بھی یا نہیں؟ بعض کے نزدیک مزاح ہو مگر اتنا نہیں ہونا چاہیے پھر کتنا ہونا چاہیے۔''

ایک فرقے کا ایمان ہے کہ ایک اوسط درجے یعنی سائز کے انشائیے میں دو تولے مزاح کافی ہے دوسرے طبقے کے خیال میں آدھی چھٹانک تو ہونا چاہیے۔ یعنی جھگڑا صرف آدھے تولے کا ہے۔

یونس تخلیقی آدمی ہے۔ اس تنقیدی تحقیقی رتی تولے کے چکر سے غافل ہے۔ بس حیران ہے۔ وہ ان سب سے الگ بھی ہے اور وہ اسے الگ کر بھی نہیں سکتے۔ میں نے یونس کا انشائیہ پڑھا تو ہنسا نہیں مگر میرے دل میں ننھے ننھے قہقہے گونجنے لگے۔ وہ ایک سچا انشائیہ نگار ہے۔ وہ ڈاکٹر ہے دردمندی اور خوش طبعی اس کا شعار ہے وہ معصوم قارئین کو ادبی نیم حکیموں سے بچانے کا ارادہ رکھتا ہے یہ لوگ کچے کشتہ فولاد کی طرح زہریلا کشتہ ادب بنا بنا کر بیچ رہے ہیں۔ یونس نے تبسم زیر لب کھلی ہنسی اور ہلکی پھلکی ہنسی کو رلا ملا کر ایک سرشاری تیار کر لی ہے جو جسم وجاں کو شاداب کرتی چلی جاتی ہے۔

ابھی یونس نے اپنا کلینک نہیں کھولا۔ ورنہ کلینک کھولنا ایک انشائیے کا عنوان ہو سکتا ہے۔ جیسے جیسے کام کوئی کرتا ہے ان پر انشائیہ لکھ دیتا ہے ہر شخص کا نامہ اعمال ہی اس کا نصیب متعین کرتا ہے چھڑی گھمانا چوری کرنا چکاری کرنا ہاتھ جوڑنا جھوٹ بولنا اور نہ شرمانا کان پکڑنا وغیرہ۔

لیکن ایک بات اس حوالے سے بڑی اہم اور دلچسپ ہے کہ اس طرح انسانی افعال کی ایک اور لغت تیار کرنی پڑے گی۔ بظاہر ہم جو کام کرتے ہیں بباطن اس کے اور بھی کئی معانی اور مقاصد ہیں جس طرح ایک انسان کے اندر کئی انسان ہیں ایک کام کرتے ہوئے وہ کئی کام کر رہا ہوتا ہے۔

یونس نے بھی کئی افعال اور اعمال کو اقوال اور احوال میں بدلنے کی فنکاری کی ہے مگر وہ چیزوں کو دیکھنے کے لیے ایک معصوم

شرارتی پرندے کی طرح دوران پرواز ہی ہر طرف نگاہ ڈال لیتا ہے۔ وہ ایک چیز کو بھی کئی مقام سے دیکھتا ہے۔ وہ مشاہدات کو خیالات بنا کر کیفیات کے سامنے سے گزارتا ہے۔ چلنا ڈرنا سینما دیکھنا' بیمار ہونا کالج جانا اخبار پڑھنا لڑانا' بے کار رہنا اس کے چند انشائیوں کے نام ہیں۔ یہ سارے کام اس کے انشائیوں میں اور کام بن جاتے ہیں۔ بے کار رہنا پڑھیں تو لگتا ہے یہ بہت بڑا کام بلکہ کارنامہ ہے۔

''بے کار بڑا عقلمند ہوتا ہے کہ وہ اتنا تو جانتا ہے کہ وہ کچھ نہیں کر رہا جبکہ اکثریت ان لوگوں کی ہے جو کسی نہ کسی بہانے خود کو مصروف رکھ کر بھی کچھ نہیں کرتے اور یہ بھی نہیں جانتے کہ وہ کچھ نہیں کر رہے بے کار ہونے کے لیے پڑھا لکھا ہونا ضروری ہے۔

یونس بٹ کا ایک انشائیہ ہے ''جیل جانا'' ایسی جیل میں جانے سے تو اس کے دشمنوں کو بھی انکار نہ ہوگا۔ ادبی لیڈروں کو یہ انشائیہ ضرور پڑھنا چاہیے کہ گھر بیٹھے بٹھائے سات سال کی قید بامشقت ہنسی خوشی کاٹ لیں گے۔

''دنیا کا بہترین ادب جیلوں میں لکھا گیا ہے۔ جس طرح شادی کے بعد کلام میں سوز اور فراق کا رنگ غالب آنے لگتا ہے ایسے جیل میں رہنے سے کلام میں آزادی کی ترنگ پیدا ہو جاتی ہے۔

جیل میں بند ہوتے ہی خیالات کے در وا ہو جاتے ہیں میرا دوست ''ف'' کہتا ہے سوچنے کے لیے بہترین جگہ غسل خانہ سونے کے لیے کلاس روم اور شاعری کے لیے جیل ہے۔''

اس کے ایک اور انشائیے کا عنوان ہے کالج کنٹین۔'' اس انشائیے کے بعد بہت سی لڑکیوں کو اس کی تلاش ہے وہ باری باری اکیلے میں چائے کی میز پر اس سے اتفاق کرنا چاہتی ہیں۔

''لڑکوں کی کنٹین سے ہر وقت قہقہوں اور لڑکیوں کی کنٹین سے چیخوں کی صدائیں آتی ہیں کہ لڑکیاں خوشی اور غمی ہر دو موقعوں پر چیختی ہیں۔ البتہ مخلوط کنٹین وہ ہوتی ہے جو لڑکوں کی ہو نہ لڑکیوں کی میرے دوست ''ح'' کا خیال ہے کہ لڑکیاں علیحدہ کنٹین کی حامی نہیں۔ اس سے ان کا بجٹ ڈسٹرب ہوتا ہے۔ مخلوط کنٹین پر شریف لڑکی وہ ہوتی ہے جو روزانہ ایک ہی لڑکے سے چائے پیتی ہے یونس جو صورتحال انشائیے میں بناتا ہے وہ پڑھنے والے کے آگے بنتی چلی جاتی ہے۔

اس نے خاکے بھی کمال کے لکھے ہیں کبھی کبھی اس کے انشائیوں پر خاکوں کا گمان ہوتا ہے۔ وہ جس چیز پر لکھتا ہے اسے کریکٹر بنا دیتا ہے۔ اسے جملہ بنانا بھی آتا ہے۔ جملہ مارنا بھی آتا ہے مگر وہ اسے سجا کر تحفے کی شکل میں پیش کرتا ہے۔ الزام بھی انعام جیسا لگتا ہے وہ اس طرح بندے نہیں مارتا۔ یار لوگ جملے کو حملے کے لیے ہتھیار کے طور پر استعمال کرتے ہیں بندوق اپنے مالک سے لی۔ رکھی

ہمسائے کے کندھے پر اور لفظوں کی گولیاں بنا بنا کر ٹھاٹھ ٹھاہ کرنا شروع کر دی۔ ان کا وار نشانے پر کم پڑتا ہے ہر بار کسی رہگیر کو مار رکھتے ہیں پھر مقتول کو اپنے مخالفوں کا آدمی ثابت کرتے رہتے ہیں۔

یونس کے کھلنڈرے فقروں میں فکر کی پختگی بھی رچی ہوتی ہے اس کے لاتعداد مزیدار اور معنی آفریں بلکہ معنی خیز فقروں میں سے چند ایک کی جولانیاں اور الہڑ جوانیاں دیکھئے۔

رقص اعضا کی شاعری ہے تو جوڈو کراٹے اعضا کی نثری نظم ہے۔

تمہارے بھائی میں بڑے آدمیوں والی خوبیاں ہیں۔ آج اس نے محلے دو لڑکوں کو لڑایا ہے۔

درد نہ ہوتا تو لوگ بڑا آدمی بننے کی بجائے صرف بڑے میاں بنتے اور سید خواجہ میر کو تخلق نہ ملتا۔

زندگی کی ابتدا بھی غلطی سے ہوئی۔ اختتام بھی غلطی پر ہوگا۔

ہمارے نقاد اتنے تیز ہیں کہ اپنے دوستوں کی غلطیوں کو خیال آرائی قرار دے دیتے ہیں اور جلدی اس لیے کرتے ہیں کہ کہیں دوست غلطی کی غلطی قرار نہ دے دے۔

اب موصوف ان کے خلاف خبریں نشر کر رہے ہیں۔ کہتے ہیں کہ میں نے اپنے بیگناہ کانوں سے ان کی نوجوان لڑکیوں کو اردو کے شعر پڑھتے سنا ہے۔

مجھے یہ دنیا بہت بڑا ایمرجنسی وارڈ لگتی ہے اخبارات اس وارڈ کی روازنہ رپورٹ ہیں۔ اسے پڑھ کر ہم کبھی کبھی خوش بھی ہوتے ہیں۔

عورتیں بچوں کو اس لیے پیٹتی ہیں کہ وہ روتے کیوں ہیں۔

ہمارے ایک دوست بحث بہت کرتے ہیں اور جو ان سے بحث میں جیت جائے اس کے مخالف ہو جاتے ہیں نہ صرف یہ بلکہ وہ جس کالج کا طالب علم ہو اس کالج کو بھی اپنا حریف سمجھنے لگتے ہیں۔

پانی ایک بے چہرہ مخلوق ہے جسے مقید نہ کیا جائے تو یہ بسیار خور ہر شے چٹ کر جائے۔ اس کا پورا وجود نہ ہوتا ہے جسے وہ ہر وقت کھولے رکھتا ہے۔

جملہ سازی کے اس نازک اور خطرناک کام میں یونس کو ایک خفیہ دوست ”ف“ کی بھرپور مدد حاصل ہے کئی مرتبہ قسم کے محققین نے ”ف“ سے شووع ہونے والے نام کے ادیبوں کی فہرست بنانا شروع کر دی ہے (یہ کام تھانوں میں بھی ہوتا ہے) کامیابی اتنی

ہوئی کہ فہرست بڑھتی جا رہی ہے۔ مقالہ ضخیم ہوتا جا رہا ہے۔ یہ جھگڑا ابھی مفید ہو رہا ہے کہ یہ "ف" صاحب ہے یا صاحبہ کچھ اسے صاحباں بنا رہے ہیں۔ صاحباں کوئی سیانی محبوبہ یعنی دوست نہ تھی۔ عورت کے بارے میں میرا خیال ہے کہ یہ بے وقوف ہے نہ عقلمند ہے۔ اگر کبھی سلیقے سے بات کہہ دے تو بڑی بات نہ ہو پیاری بات ضرور ہو جاتی ہے۔

سلیقے سے بات کرنا ہی اصل فن ہے "ف" کے علاوہ یونس نے انشائیوں میں "ر" "ح" "ع" "و" کے خیالات سے بھی فائدہ اٹھایا ہے غالباً وہ حروف تہجی سے وہ کام نکالنا چاہتا ہے جو کسی نے نہیں نکالا۔

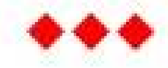
یونس فطری طور رپ سادہ اور بھلا آدمی ہے۔ "چاہ خنداں" کا انتساب اس کی راز دارانہ وابستگی اور عزیزانہ وارفتگی کی دلیل ہے۔ انتساب ایک جیسے تین آدمیوں کے نام ہے جو گوشہ گمنامی کی جنت کے باشندے ہیں۔ ان میں سے یونس منصور ایک عمر پاکستان ٹیلیوژن سے وابستہ ہے مگر ٹیلی فون پر بات سے بھی گریز کرتے ہیں۔ ان کی ایک نایاب خصوصیت کا ذکر یونس نے اس طرح کیا ہے۔

"اپنی خامیاں تو ہر کوئی چھپاتا ہے مگر میں نے انہیں اپنی خوبیاں بھی چھپائے پھرتے دیکھا۔

یونس بٹ کے کمالات اور خیالات بھی جب تک انکساریوں اور دلداریوں میں چھپے ہوئے زندہ رہیں گے تو بڑی بڑی امیدیں اس کے ساتھ وصال کے لیے بے تاب پھریں گی اس نے چھوٹی سی عمر میں جو کامرانیاں اور شادمانیاں پالی ہیں۔ ان کا تسلسل صرف تحمل اور تجمل کے کسی امتزاج کو اپنے جسم وجاں میں سنبھال رکھنے سے ہی ممکن ہے۔

"چاہ خنداں" ٹھنڈی میٹھی فرحتوں کا ذخیرہ ہے اس کنویں کا پانی ختم ہونے والا نہیں۔

تیڈے کھوہ تے آئیاں



کچی سیاہی گورے لفظ

مجھے طاہر اسلم گورا کے افسانوں نے بھی کچھ پریشان کیا۔ کچھ پریشانی اسے دیکھنے کے بعد کم ہوگئی۔ افسانوں والی پریشانی کا میں تھوڑی دیر بعد ذکر کروں گا فی الحال ہم نام کی بات کرتے ہیں کہ اب ہمارا کام ہی صرف یہ رہ گیا ہے۔

کام کو چھوڑ کے ہم نام کے پیچھے ہیں عطا
وہ شجر بوئے نہیں جن کے ثمر مانگتے ہیں

طاہر نوجوان ہے کسی کے پیچھے لگنے کے لیے اس کے سامنے بہت سی چیزیں کام کی چیزیں ہیں۔ نام کمانے کی ابھی اس کی عمر نہیں۔ اس نے افسانے بھی اپنی عمر کے حساب سے لکھے ہیں۔ یہ حساب کتاب کر کے دینے والے بہت نقاد اسے مل جائیں گے۔ میرے ذہن میں تو لفظ گورا اٹکا ہوا ہے۔ شاید گورا اس کا تخلص ہے یا ذات ہے۔ اب تخلص کا رواج افسانہ نگاروں میں بھی ہو رہا ہے۔

ابھی تک مجھے معلوم نہیں کہ طاہر کا رنگ روپ ان کا ذاتی ہے یا خاندانی مجھے ذاتی ور پر سانولا رنگ اچھا لگتا ہے۔ شام کے رنگ جیسا بھی حسن مشرق کی انفرادیات ہے مگر کیا کریں کہ ہماری لڑکیاں رنگ گورا کرنے والی کریموں پر سب سے زیادہ پیسے خرچ کرتی ہیں۔ اور گھر سے باہر نکلنے کے لیے گھنٹوں میک اپ کرتی ہیں میک اپ کرنے کا مطلب اپنے آپ کو گرا چٹا کرنا ہے طاہر اسلم گورا اندر سے سانولا ہے کہ اس کی عادتوں میں سارے رنگ مشرق کے ہیں یعنی اپنے ہیں۔

ایک اچھے دل والے بھولے بھالے نوجوان کے لیے گورا صاحب کا خطاب پہلے پہلے عجیب لگتا ہے جبکہ ہمارے ہاں آج کل کالے صاحب کا راج ہے دونوں ہمارے حکمران ہیں۔ گورے کا چہرہ گورا اور کالے صاحب کا دل کالا ہے۔ دونوں اسم بامسمہ آپ یقین مانیں کہ مریا ایک کالے صاحب سے کام تھا۔ چکر لگتے رہے۔ کام نہ ہوا بالآخر میرے ایک اولڈ اویند دوست نے اس سے کہا

یار تم بہت مصروف ہو۔ بھول جاتے ہو یہ نام کہیں لکھ لو اور کام کر دو۔

وہ بولا۔ جناب فکر نہ کریں یہ نام تو میں نے دل پر لکھ لیا ہے۔

تو میرے دوست نے کہا۔

اوئے دل پر نہیں کاغذ پر لکھو۔ تمہارا دل کالا ہو چکا ہے۔ وہاں جگہ ہی کب ہے ہمارے عہد میں دلوں کا جہان سیاہ دھوئیں سے

بھر چکا ہے۔اور انسان کے اندر اندھیرا چھا گیا ہے۔ ہر طرح کے گوروں نے تہذیبی وثقافتی ترقی کے نام پر اندھیرا گردی مچادی ہے۔ میرا خیال ہے کہ طاہر کی یہ خواہش ہے کہ لوگ اندر سے روشن ہو جائیں۔ وہ جو روشن چہروں والے ہیں۔ان کے دل بھی چمک اٹھیں۔ جو سوہنے ہیں اچھے بھی ہو جائیں۔اچھے کا لفظ میں نے مہربان کے معنوں میں استعمال کیا ہے نیک کے معنوں میں نہیں۔ میری خواہش ہے کہ ہمارے نوجوانوں کو محبت کے صحیح معنی آ جائیں یہاں بھی وضاحت کے لیے عرض ہے کہ محبت کے لیے ہر کسی کے اپنے معنی ہوتے ہیں اور وہی صحیح ہوتے ہیں۔ یہ معنی ظاہر نے اپنے طور سے سمجھنے کی کوشش کی ہے اور اسی کوشش کو اپنی خواہش کے ہمرنگ کرنے کے لیے افسانے لکھے ہیں۔ یہ افسانے فن کے اعلیٰ معیاروں پر بھی پورا اترتے ہیں یا نہیں میں نے دیکھا کہ بدرنگی کہیں پیدا نہیں ہوتی۔ اور میرے نزدیک بے رنگ ہونا بدرنگ ہونے سے بہتر ہے۔لوگ تو لفظوں میں اپنے معانی ڈالنے کی سازشیں کرتے رہتے ہیں۔ جس طرح ہمارے گوالے دودھ میں پانی ڈالتے ہیں اور اسے گاڑھا کرنے کے لیے گندا پانی ڈالتے ہیں۔

طاہر نے اپنے پیش لفظ میں انسان یعنی ادیب کے ظاہر و باطن کے ایک ہونے آرزو کی ہے اور ادبی گروہ بندی ختم کرنے کی اپیل کی ہے۔ابھی عزیز طاہر اسلم گورا کا ظاہر و باطن ایک ہے۔ وہ اندر سے بھی اسی طرح اجلا ہے۔ ویسے اس عمر میں بالعموم ظاہر و باطن ایک ہوتا ہے۔منافقتوں اور مصلحتوں کی کالک اس دریائی عمر میں عموماً دل پر جم نہیں سکتی۔طوفان کی چھاؤں میں پروان چڑھتا ہے۔

افریقہ کے بہادر کالوں نے ٹھیک کہا ہے کہ ہمارا خدا بھی کالا ہے ایک وفادار خاتون نے اپنے شوہر کے لیے کہا تھا۔

بھانویں کالا اسے میرے لیے چنگا اے اپناتے ہے۔

تو اصل بات چنگا ہونا ہے۔اپنا ہونا بلکہ اپنا ہونا ہی ہے۔

طاہر کے افسانوں میں لوگوں کو خاص طور پر لڑکوں کو چنگا اور اپنا بنا کر دیکھنے کی خواہش تڑپتی مچلتی دکھائی دیتی ہے۔ وہ خواہش ہی کیا ہے جو لہو میں تڑپے نہیں آنکھوں میں مچلے نہیں۔اس عمر میں لڑکیوں کے لیے پسندیدگی فطری بات ہے میرے پیارے رسول نے بھی عورت اور خوشبو اور نماز کو محبوب قرار دیا۔ مجھے یہ تینوں چیزیں ایک جیسی لگتی ہیں۔کیا خیال ہے اس مسئلے میں صاحبان فتویٰ کا۔

کچھ لوگوں کو طاہر کے بارے میں ایک چھوٹی سی شکایت ہے کہ اس نے کچی عمر کے جذبوں کی بات کی ہے۔نجانے یہ ہمارے پکی عمر کے لوگ ان باتوں کے کیوں خلاف ہیں۔کیا ان کی زندگی میں یہ عرصہ عمر نہیں گزرا ہوتا۔ پھر کیا اس عرصہ عمر کی قیامتوں کو انہوں نے محسوس نہیں کیا ہوتا۔خدانخواستہ کہیں انہیں جوانی کی غلط کاریاں تو تنگ نہیں کرتی رہتیں۔آج وہ بڑھاپے میں آ کر جوانی کو ممنوعہ

علاقہ کیوں قرار دیتے ہیں۔ میں اس کے آگے کچھ نہیں کہوں گا کہ ہمارے پاس کئی چھوٹے چھوٹے ڈاکٹر اسرار احمد ہیں وہ تو خیر ڈاکٹر ہیں۔ ایسے کمپونڈر بھی بہت ہیں۔ اس قبیلے کی زمین بھی کم نہیں پتہ نہیں کیا ہوتا ہے۔ کہ لوگ ہر عمر کے لوگوں سے اپنی عمر کے حساب سے توقعات وابستہ کرتے ہیں۔ چھوٹوں سے بڑوں جیسے کام کی امید لگتے ہیں جوانوں سے بوڑھوں جیسے اعمال کی توقع رکھتے ہیں۔ ہمارے مرد اور عورتیں بھی اپنے پانے کام بدلنا چاہتے ہیں۔ جبھی تو وہ طاہر اسلم گورا سے انتظار حسین لیسے افسانے لکھوانا چاہتے ہیں انتظار صاحب کے افسانے پڑھ کر کہا جا سکتا ہے۔ کہ وہ کسی انتظار سے واقف ہی نہیں۔ وہ نہیں جانتے کہ وہ بچپن میں بھی بچے تھے۔ وہ تو بچپن سے سیدھے پچپن برس کے ہو گئے ہیں۔ ان کا پہلی کہانی بھی کسی کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ کچھ لوگ سمجھتے ہیں کہ وہ ماں کے پیٹ سے عظیم اور بزرگ کہانی کار کے طور پر پیدا ہوئے ہیں۔ طاہر جلدی جلدی کسی ادبی عظمت کا منتظر نہیں وہ عظمت کا منتظر ہے مگر یہ کسی نوجوان اور زندہ لڑکی کا نام ہونا چاہیے۔ مس عظمت وہ ان لڑکوں کو ہمسفر کہتا ہے اور انہیں ہمراز بنانے کی کوشش میں ہے۔

ہر عرصہ عمر کی اپنی ایک سچائی ہوئی ہے۔ طاہر نے اپنی کتاب میں سچائی لکھی ہے اور سچائی مزیدار بھی ہوتی ہے۔ اردو کی ممتاز افسانہ نگار محترمہ الطاف فاطمہ نے عمر کے اس حصے کو جس میں پوری طرح رہتے ہوئے طاہر نے افسانے لکھے ہیں۔ میٹھا برس کہا ہے۔ اس لذت بھرے زمانے کے لیے اس سے بہتر کوئی لفظ نہیں محترمہ الطاف فاطمہ نے حرف آخر کے طور پر کتاب کے فلیپ میں جو بات کہی ہے وہ حرف اول بھی ہے۔ ابتدا کی دہلیز پر کھڑے ہو کر دیکھا جائے تو انتہا کی خبر بھی جلدی مل جاتی ہے ابھی طاہر کے بیشتر افسانوں کی بنیاد جنس مخالف کے لیے ایک شخص کا احساس ہے جو اس نئی نویلی عمر کا تقاضا ہے لیکن اس کے باوجود کوئی مریضانہ بات نہیں ملتی۔ صحت مند رویہ ایک فلسفہ حیات کے طور پر بکھرتا ہے۔

صحت مند رویہ کی خصوصیت کا ذکر اس کے لیے بامعنی ہے کہ وہ ڈاکٹر بن رہا ہے مگر میں پریشان ہوں کہ ڈاکٹر تو قبیلہ اسرار احمد بھی ہیں اور ایم بی بی ایس ہیں انہیں اب ایم بی بی ایس سے بھی چڑ ہے کہ اس میں لفظ بی بی پھنسا ہوا ہے۔ اور وہ بی بی کے لفظ کے لیے بھی اس طرح کی حالت برداشت نہیں کر سکتے۔

گورا صاحب نے بہت بڑی ذہانت اور جرات کا ثبوت یہ دیا ہے کہ اس نے نوعمری کی تیز ہوا کے سینے پر کچی سیاہی سے جو افسانے لکھے ہیں انہیں فوری طور پر چھپوا دیا ہے ورنہ ان کا بھی وہی حشر ہوتا جو ادبی دنیا میں ایسے کئی لوگوں کا ہوا کہ عمر بھر کتاب بھی نہ چھپ سکی۔ اس کے لفظ اس کے چہرے کی طرح روشن ہیں یعنی گورے ہیں۔

پچاس برس سے کچھ کم کی عمر میں اٹھارہ برس سے کچھ سال اوپر والی تحریر آدمی خود چاہے تو چھپوا نہیں سکتا۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ

پچاس برس کی عمر میں بیس سال کی عمر والے کام نہیں ہو سکتے۔ تو پھر اس عمر والے سے کوئی توقع ہے کہ وہ پیغمبروں کی عمر والے کام کرے۔ گوراجی نے افسانوں میں ٹھیک نشانے لگائے ہیں۔ فن کے میدان میں وہ پہلا معرکہ جیت گیا ہے اس کے افسانے کا عنوان ہے ''موڑ'' کبھی کبھی وہ موڑ آنے سے پہلے بھی کہیں مڑ جاتا ہے تو اکڑی ہوئی گردنوں والے سینئر لوگوں کو لمبا چکر کاٹنا پڑتا ہے تب انہیں پتہ چلتا ہے کہ یہاں بھی ایک منزل کے آثار تھے۔ اب منزلیں ان کی دسترس میں نہیں وہ کسی مقام کو منزل تسلیم ہی نہیں کرتے۔ گوراجی کو پہلی منزل مبارک ہو۔ کئی بڑی منزلیں اس کی راہ دیکھ رہی ہیں۔

◆◆◆